نشان منزل دار العلوم تاج المساجد بھوپال کا پندرہ روزہ اصلاحی و دینی جریدہ ہے، اس کا ہر سال ایک خاص نمبر بھی شائع ہوتا ہے، ۷۲ء کا خاص نمبر بھوپال کے مشہور عالم ربانی اور عارف باللہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجددیؒ کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے، اس میں ان کے سوانح و حالات، فضائل و کمالات، سیرت و کردار اور شریعت و طریقت میں جامعیت وغیرہ سے متعلق متنوع مضامین ہیں، "اضغاث و احلام" کے عنوان سے خود حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک بیش قیمت رسالہ درج ہے، اکابر میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی کے مضامین نے اس نمبر کو زیادہ اہم بنا دیا ہے، مولانا محمد عمران خاں کے دونوں مضامین "نادر تشخیص بر محل تجویز" اور "حضرت صاحب کا سفر آخرت" بڑے اثر انگیز ہیں، صاحبزادہ مولانا محمد سعید مجددی اور لائق مرتب کے مضامین بھی خاصے ہیں، شعراء نے منظوم ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے، ایک مضمون میں حضرت کی وفات کے بارہ میں رسائل و جرائد کے تاثرات نقل کیے گئے ہیں، آخر میں صاحبزادہ محترم اور مولانا محمد عمران کے نام کے تعزیتی خطوط درج ہیں، ان سے حضرت کی عظمت و مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ اس دور کے ایک نامور بزرگ کی زندگی کا بڑا سبق آموز اور ایمان افروز مرقع ہے۔

تجلی ڈاک نمبر - اڈیٹر مولانا عامر عثمانی متوسط سائز کاغذ معمولی، کتابت طباعت بہتر، صفحات ۱۱۴ قیمت ۶ پتہ ماہنامہ تجلی، دیوبند۔

ماہنامہ تجلی اکثر خاص نمبر شائع کرتا ہے، اس کے عام شماروں میں "تجلی کی ڈاک" کے زیر عنوان قارئین کے مختلف النوع سوالات کے جواب درج ہوتے ہیں، اس نمبر کا تقریباً تہائی حصہ استفسارات کے جواب پر مشتمل ہے، اور بقیہ حصے میں تجلی کے بعض مستقل عنوانات "آغاز سخن، کھرے کھوٹے" اور مزاحیہ حصہ "مسجد سے میخانے تک" کے علاوہ بعض دیگر مضامین نظم و نثر بھی دیے گئے ہیں، استفسارات کے جواب پر از معلومات ہیں لیکن ان میں کہیں کہیں طوالت اور لہجہ تیز ہو گیا ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۱ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۳ء عدد ۳

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

٭٭٭

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے بارہ میں مسلمانوں میں جو اضطراب اور جس طرح اس مسئلہ میں اُن کی آواز متحد ہے اس سے حکومت کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کسی حال میں بھی اس سے دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں، مسلم یونیورسٹی اُن کی عزیز ترین متاع، اُن کی تمناؤں کا مظہر، اُن کی ایک صدی کی محنت کا پھل اور اُن کے دل و دماغ کا سرچشمہ ہے، اُن کی تقریباً تمام بڑی بڑی شخصیتیں اسی نے پیدا کیں جنھوں نے ہر میدان میں نمایاں کارنامے کئے اور ملک و ملت دونوں کی بہترین خدمات انجام دیں، مسلمان اس کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ اُس کے اقلیتی کردار کو ختم کر کے اس کی روح نکال لی جائے، اور اس سرچشمہ کو ہمیشہ کے لئے خشک کر دیا جائے۔

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ جمہوریت، سیکولرزم اور تعلیم کی آزادی کا ہے، اسی لئے بہت سی جمہوری پارٹیاں اور آزادیٔ تعلیم کے حامی مسلمانوں کے ساتھ ہیں، یونیورسٹیوں میں بھی اس کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے، درحقیقت تعلیم گاہیں ہی وہ سرچشمے ہیں جن سے روشن دماغ اور اعلیٰ صلاحیتوں کے افراد پیدا ہوتے ہیں، جو ملک کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں، اور حکومت کو اس کی غلط روی پر ٹوک بھی سکتے ہیں۔ اس لئے روس کے علاوہ سارے مہذب ملکوں میں تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہے۔ اس کو صرف اس حد تک مداخلت کا حق ہے کہ اُن کا کوئی عمل ملک کے مفاد کے خلاف نہ ہو، اگر انھیں بھی انسانوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی فیکٹری بنا لیا جا

تو ملک آزاد عالی دماغ انسانوں سے محروم ہو جائیگا جو جمہوریت کے لئے بڑا المیہ ہوگا۔

ہندوستان کا دستور جمہوری اور سیکولر ہے، اُس نے اقلیتوں کو اپنی ضرورت کے مطابق ادارے قائم کرنے کا حق دیا ہے، اسلئے کسی اقلیتی ادارہ کو اس کے کردار سے محروم اور اُن کی متحدہ آواز کو نظر انداز کرنا دستور کے بھی خلاف ہے اور جمہوریت کے بھی، باقی کچھ مسلمان تو ہر مسئلہ میں حکومت کے ہم نوا ہو ل جائیں گے، مگر انکی جو حیثیت ہے وہ خود حکومت کی نگاہوں سے مخفی نہیں، اُن میں وہ مسلمان بھی ہیں جو کلام مجید کے صریح احکام میں تبدیلی چاہتے ہیں، اور وہ بدبخت بھی ہیں جو اس کو نام نہاد ترقی میں مزاحم دقیانوسی کتاب سمجھتے ہیں، ایسے لوگ مسلمان کہلانے کے کب مستحق ہیں، اور اُن کو مسلمانوں کا ترجمان سمجھنا کہاں تک صحیح ہے، اگر جان بوجھکر حکومت ان کا سہارا لیتی ہے تو دونوں فائدہ اٹھانے کے لئے ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں، ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے اور اس کا حسن اسی رنگارنگی میں ہے، اسی لئے اس کا دستور سیکولر رکھا گیا ہے اور ان سب کو اپنے مذہب اور تہذیب و روایات کو قائم رکھنے کا پورا حق دیا گیا ہے، اس لئے قومی ایکتا اور قومی دھارے کے نام پر ان سب کو ایک رنگ میں رنگنے کی کوشش دستوری ضمانت کے سراسر خلاف ہے، قومی ایکتا اور قومی دھارے کا مطلب آپس کے تعلقات میں اتحاد و خوشگواری اور ملک کی خدمت اور اس کے مفاد میں اتحاد و یکجہتی ہے، یہ ہرگز نہیں ...... کہ سارے فرقے اپنی خصوصیات مٹا کر ایک ہی دھارے میں بہ جائیں، اس کو کوئی فرقہ بھی گوارا نہیں کر سکتا، اس سے اتحاد و یکجہتی کے بجائے اور اختلاف و انتشار پیدا ہوگا،

کچھ لوگوں کو مسلم یونیورسٹی میں فرقہ پروری کی بو آتی ہے اور اُن کے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ اُس کا اقلیتی کردار ختم کر دیا جائے، اس کا بھی الٹا اثر پڑے گا، اس سے فرقہ وارانہ جذبات اور ابھریں گے، لیکن

یہ الزام ہی سرے سے غلط ہے جس یونیورسٹی نے مولانا محمد علی، شوکت علی، عبدالمجید خواجہ تصدق احمد خان شیروانی ڈاکٹر سید محمود، رفیع احمد قدوائی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے سیکڑوں قوم پرور پیدا کئے ہوں، اور جنھوں نے کس زمانہ میں انگریزوں کے نظام تعلیم کا بائیکاٹ کیا ہو اور مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں ایک آزاد قومی یونیورسٹی قائم کردی ہو، جبکہ مالوی جی نے قوم پرور ہندوؤں کو ہندو یونیورسٹی میں قدم نہ رکھنے دیا تھا، اس پر فرقہ پروری کا الزام سراسر بہتان ہے، یہ قومی یونیورسٹی آج بھی قوم پروری اور سیکولرزم کی سب سے بڑی معلم ہے، باقی کسی تعلیمی ادارے سے سو فیصدی ایک خیال کے لوگ پیدا نہیں ہوتے، کیا ہندو یونیورسٹی سے مہا سبھائی اور جن سنگھی نہیں پیدا ہوئے، وہ تو آج بھی آر۔ ایس۔ ایس۔ کا گڑھ ہے لیکن کس اس جرم میں کسی میں اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت ہے، یہی معاملہ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ بھی ہونا چاہئے

ہمارا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ ہندو اور مسلم دونوں یونیورسٹیوں کو تعلیم کے ساتھ ہندو اور مسلم تہذیب و ثقافت کا بھی مرکز ہونا چاہئے، یہ فرقہ پروری نہیں، بلکہ حکومت کی سیکولرزم کا عملی نمونہ ہوگا، کسی تہذیب و ثقافت کا مرکز ہونا قطعی فرقہ پروری نہیں، بلکہ دوسری تہذیبوں کی مخالفت فرقہ پروری ہے، ان دلائل سے قطع نظر حکومت کو اپنے وعدوں کا بھی تو لحاظ کرنا چاہئے۔ وہ گذشتہ الیکشن سے پہلے کیا وعدہ کرتی چلی آئی تھی۔ اور اب اس کا عمل کیا ہے، اس کا اثر مسلمانوں پر کیا پڑے گا۔ اس لئے یقین ہے کہ وہ بھی دیر سویر صحیح نتیجہ پر پہنچے گی، لیکن جس قدر جلد اسکو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے، اسی قدر بہتر ہوگا۔

مقالات

مولانا محمد علی کی یادیں

از سید صباح الدین عبدالرحمن

(۴)

مارما ڈیوک پکتھال کے خطبۂ صدارت کے بعد ایسکس ہال کا مجمع مولانا محمد علی کی تقریر سننے کا مشتاق تھا، انھوں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا:-

"میں ایک ایسی جگہ آیا ہوں جو جمہوریت کا قلب ہے، اور میں دنیا کے اس حصہ سے آرہا ہوں جو کہ بیسویں صدی میں بھی استبدادی طریقے کے لیے بدنام ہے، لیکن یہاں آکر میرے لیے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ سات ہزار میل کی بحری اور بری مسافت کو طے کرنے کے بعد کوئی فرق نظر آتا ہے، ہم نے محسوس کیا کہ ترکوں کے دشمنوں نے انکے خلاف عرصۂ دراز سے پروپگنڈا جاری کر رکھا ہے، ہمارے پاس اس پروپگنڈے کی تردید کے لیے نہ تو سرمایہ ہے اور نہ وہ ضابطۂ اخلاق ہے جو چاہیے، لیکن ہم کو کچھ کرنا ہے، ہم جس پیام کو لیکر آئے ہیں، اس کو یہاں کے لوگوں تک پہنچانا ہے، ان کو اس انتباہ سے بھی آگاہ کرنا ہے جو ہم کو دینا ہے، یہاں بہت کم لوگ ہیں جو ترکوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں، ترکوں کو نہ صرف برے دن کا سامنا کرنا ہے بلکہ ان کو بری زبانوں سے بھی سابقہ ہے، ہاں ایسے انگریز ضرور ہیں جو ترکوں سے واقف ہیں، اور جو ان سے واقف ہیں وہ ان سے ہمدردی رکھتے ہیں، میری ملاقات کسی ایسے انگریز سے ابتک نہیں ہوئی جو ترکوں سے لڑا ہو لیکن ان کے بارے میں اچھی رائے نہ رکھتا ہو (صدائے تحسین) برطانیہ کے ایسے لوگوں کی تعداد کثرت ہے جو وطن سے باہر نہیں نکلے ہیں، اور جو ترکوں کو مطلق نہیں جانتے ہیں،

پھر بھی وہ ان کے خلاف تعصب رکھتے ہیں، یہ محض اس لیے کہ ترکوں کے دشمنوں نے
تعصب کا زہر اس طرح پھیلا رکھا ہے کہ اس کا نقش مٹائے نہیں مٹتا، ایسی صورت
میں لوگ میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھ کو یہ رائے دی کہ میں اپنے مطالبات
میں سختی نہ برتوں، انگریزوں کے مزاج کو غلط طریقہ سے برہم نہ ہونے دوں بلکہ معتدل
بن کر کامیابی حاصل کروں۔" یہ سن کر میں نے اپنے سے پوچھا کہ کیا اس وقت میں
جمہوریت کی ایسی سرزمین میں ہوں جہاں کہ برسر اقتدار لوگ اپنی سیاست لوگوں
کی خواہش کے مطابق بناتے ہیں، یا میں ایسے ملک میں ہوں جہاں کے کروڑوں کی
آبادی اپنی سیاست میں مٹھی بھر غیر ملکی استبداد کی محتاج رہتی ہے، (صدائے تحسین)
جب ہم اس ملک میں پہنچے تو ہم پر زور دیا گیا کہ ہم ان خیالات کی نمایندگی نہ کریں جنکو
لے کر ہم یہاں آئے ہیں، بلکہ ہم یہاں کے اونچے حلقہ کے استبداد پسندوں کے
خیالات کو مد نظر رکھ کر ان کی مزاجداری کریں، لیکن اے خواتین و حضرات! میں نے
یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنے لوگوں کے خیالات میں ترمیم کر کے اعتدال نہ پیدا کروں گا، کیونکہ
ان کے مطالبات خود ہی معتدل ہیں، ہم اس پیام کو یہاں کے لوگوں تک ضرور پہنچائینگے،
جو ہم اپنے لوگوں کی طرف سے لے کر آئے ہیں، میں اپنا کوئی مطالبہ آپ پر ٹھونسنے
کی کوشش نہ کروں گا، میں جو کچھ پیش کروں گا، اس میں دلائل ہوں گے، اس کے
لیے آپ سے بحث و مباحثہ کروں گا، اس کی تصریح کروں گا، اور اگر میری کوئی
بات غیر واضح ہو یا بالکل نئی ہو یا چونکا دینے والی ہو تو میں اس انصاف اور
کھلے ہوئے ذہن کا سہارا لوں گا جو انگریزوں کی پرانی روایت رہی ہے، (تالیاں)
سامراج پسند، استعمال کرنے والے اور ہاتھوں میں کلہاڑی رکھنے والے لوگ

برطانوی امپائر کو ایک خطرناک منزل کی طرف لے جا رہے ہیں، اگر آپ کو اپنے
امپائر کی قدر ہے، تو آپ صبر و سکون کے ساتھ میری باتوں کو سنیں اور میں جو کچھ
کہوں اس پر غور کریں۔

بعض حلقوں میں ہمارے وفد کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے،
خواتین و حضرات! میں آپ کو بتاؤں کہ ہم کون ہیں، ہم کس کی نمایندگی کرنے آئے
ہیں، ہم کو یہاں آل انڈیا خلافت کانفرنس نے بھیجا ہے، جو اس وقت ہندوستان کی سب سے
بڑی اور سب سے زیادہ نمایندہ قومی جماعت ہے، انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ
بڑی اور اہم سیاسی تنظیمیں ہیں، لیکن ہم جس کانفرنس کی نمایندگی کر رہے ہیں، وہ
ان دونوں سے بڑی اور اہم ہے، آل انڈیا خلافت کانفرنس کے جس اجلاس
میں یہ طے ہوا کہ ہم وفد کی شکل میں یہاں آئیں، اس میں بیس ہزار ہندو اور مسلمان
شریک تھے، اور اس کی کارروائی شام کے چھ بجے سے شروع ہوئی اور دو بجے
رات تک جاری رہی، میں نے اپنی پوری زندگی میں ہندوستان کے کسی جلسہ میں وہ
جوش و خروش نہیں دیکھا جو اس میں دیکھنے میں آیا، اور اب ہم جب کہ یہاں ہیں، ہندستان
کے اندر کیا ہو رہا ہے، ہمارے پاس ہندوستان کے ہر حصہ سے تار پہنچ رہے ہیں،
چاٹگام جیسی چھوٹی جگہ میں پندرہ ہزار لوگوں کا مجمع ہوا، ان کی طرف سے بھی تار آیا، یہ
ہم کو یہاں لوگوں نے بھیجا ہے، ہم ان سرکاری حکام کی طرف سے نہیں آئے ہیں، جو کسی کی
بھی نمایندگی نہیں کرتے، ہمارے متعلق یہ بھی جان لیں کہ ہم میں سے بعض لوگوں نے قید
کی سزا کی مشقت جھیلی ہے، اور ایسی سزا جو مذہبی سرگرمیوں کی خاطر کسی مقدمہ کے
بغیر محض حکام کے وہم پر دی گئی، اور ہندوستان میں قانون کا استعمال اس طرح

کیا جا رہا ہے کہ ہم میں سے جو سب سے اچھے لوگ ہیں وہ جیل جانا اپنی بڑی عزت سمجھتے ہیں، کیا اس کی ضرورت ہے کہ ہم آپ کو آپ کی پرانی تاریخ کے واقعات یاد دلائیں ہمپیں اور ہیمپڈن نے کیا کیا مصائب اس آزادی کی خاطر برداشت کیے جن پر آج آپ کو فخر ہے، میں انگریز مردوں اور خواتین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو اس حق سے محروم نہ کریں جس سے ہم آپ سے کچھ کہہ سن سکیں محض اس بنا پر کہ ہندوستان میں آپ کے نمایندوں نے ہم کو آزادی سے محروم کر رکھا ہے، (صدائے تحسین)

گذشتہ جمعہ کو مسٹر لائڈ جارج نے ڈاؤننگ اسٹریٹ میں کہا کہ انھوں نے مسلمانوں کی نمایندہ رائے سے مشورہ لیا ہے، اور ہندوستان کی رعایا کے خیالات کے احترام کا پورا لحاظ رکھا ہے، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سے لوگ ہیں جن کی حکومت نے سماعت کی، ہندوستان کے سات کرور مسلمانوں میں سے کوئی بھی صلح کانفرنس میں شریک نہیں ہوا، لارڈ سنہا میرے ذاتی دوست ہیں، میں انکی عزت ہی نہیں بلکہ ان سے محبت بھی کرتا ہوں، وہ ہندوستان کے نمائندے نہیں ہو سکتے، اگر حکومت نے ہندوستان کی دو قسم کی رائیں حاصل کر لی ہیں تو پھر یہ شائع ہونی چاہئیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ صلح کانفرنس میں ان نامعلوم لوگوں نے کیا کہا، ہندوستان کی اصلی آواز تو دبا دی گئی ہے، وہاں کوئی آدمی ایسی بات کہتا ہے جو حکومت کو پسند نہیں ہوتی ہے تو وہ قید میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اخبارات کی اشاعت بند کر دی جاتی ہے، اور ایسے اخبارات شائع نہیں ہونے دیے جاتے جو ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات کا اظہار کر سکیں، میں ایسے ایک درجن اخبارات کا نام بتا سکتا ہوں، جو چھ مہینے سے زیادہ جاری رہنے نہیں دیے گئے، اس لیے نہیں کہ ان کے پڑھنے والے نہیں تھے، بلکہ

اس لیے کہ وہ بہت پسند کیے جاتے تھے، ان کو پریس ایکٹ کی گرفت میں لاکر صوبوں میں جانے سے روک دیے گئے، میرا انگریزی ہفتہ وار کامریڈ بھی اسی تحت میں لایا گیا، اس کی ضمانت صرف ایک مضمون کے شائع ہونے پر اسی روز ضبط کر لی گئی جس روز کہ مارننگ پوسٹ، ڈیلی ٹیلی گراف اور نیو اسٹیٹسمین میں اس کی تعریف نکلی، میرا اردو اخبار ہمدرد بھی اسی قانون کی زد میں آگیا، حالانکہ جنگ عظیم کے زمانے میں اس کی تعریف وہی حکام کرتے رہے جنھوں نے اس کو کسی اطلاع کے بغیر موت کے گھاٹ اتارا، یہ تو صرف دو مثالیں ہیں، اسی قسم کا رویہ مسلمان رہنماؤں کے ساتھ بھی اختیار کیا گیا، دیوبند کے مولانا محمود الحسن صاحب ہندوستان کے بہت بڑے مذہبی پیشوا ہیں، حکومت نے ان کو اپنے مطلب کی خاطر استعمال کرنا چاہا، مگر انھوں نے بزدلی نہیں دکھائی، ان کی عمر ستر سال کے قریب ہے، لیکن ان کو ہندوستان چھوڑنا پڑا، ان کو ڈر پیدا ہوا کہ مذہب کے نام پر ان سے کسی ایسی تحریر پر دستخط لیے جانے کی کوشش کی جائے گی، جو ان کا ضمیر پسند نہ کرے، وہ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے، جہاں امید تھی کہ ان کے ضمیر پر کوئی جارحانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے گا، لیکن وہاں بھی ان پر اسی بات کے لیے دباؤ ڈالا گیا جس کا انھیں ڈر تھا، اور اس کا نتیجہ کیا ہوا، وہ اسلام کی مقدس ترین جگہ میں شریف کے ذریعہ گرفتار کیے گئے اور مصر بھیج دیے گئے، لیکن حکومت کو یہ خوف پیدا ہوا کہ ایسے ایماندار اور پاک ضمیر رکھنے والے شخص کی موجودگی سے مصر کے باشندے کہیں متاثر نہ ہو جائیں، اس لیے ان کو مالٹا میں لیجا کر محبوس کر دیا گیا، اور وہ ابتک وہاں ہیں، حالانکہ شاہی اعلان سے اور سب کو معافی دے دی گئی ہے، یہ شکایت بھی سننے میں آئی کہ ان کو اور انکے ساتھیوں کو پوری غذا نہیں دی جاتی ہے، معلوم نہیں

یہ صورت حال ابھی تک جاری ہے یا ختم کر دی گئی، ان کی مشروط رہائی کی خبر ملی تھی لیکن انھوں نے مشروط طور پر رہا ہونا پسند نہیں کیا، سورہ یوسف میں خود حضرت یوسفؑ کی زبانی ہے کہ "اے میرے مولیٰ قید خانہ مجھکو اس چیز سے زیادہ عزیز ہے جس کے لیے مجھکو دعوت دی جاتی ہے"۔ ہندوستان کے تمام مسلمان اس برے رویہ پر احتجاج کر رہے ہیں، اور اگر مولانا کی جلد رہائی نہیں ہوئی تو اس کے نتائج بہت ہی خطرناک ہونگے،

ہندوستان میں مسٹر مانٹیگو آئے، تو میری اور میرے بھائی کی نظربندی پر احتجاج کی تجدید ہوئی۔ ان کے پاس ایک روز میں لاکھوں تار پہنچے، ہم دونوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا، اس احتجاج سے ہم اپنی مقبولیت پر خوش ہو سکتے ہیں لیکن ہم خوش نہیں ہو سکتے، یہ مقبولیت دراصل خلافت تحریک کی بھتی جس کو ہم نے مذہبی فریضہ سمجھ کر فروغ دیا، ٹائمس اخبار کی نظر میں یہ ساری باتیں مذمت کے لائق ہیں، لیکن ہمارے اور ہمارے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے یہ باتیں قابلِ فخر ہیں،

ہم کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ہم یہاں ہندوستان کے لوگوں کی نمایندگی کرنے آئے،

ہمارے وفد میں دو تو صحافت نگار ہیں جو ہندوستان کی رائے عامہ کی ترجمانی کرتے رہے ہیں، اور وہ یہاں اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ وہ برطانوی سیاست سے ناواقف نہیں ہیں لیکن ہمارے لوگوں نے ہمارے ساتھ ایک مشہور ممتاز مستشرق اور عالم کو بھی بھیجا ہے، تاکہ وہ ہندوستان کے علماء کی نمایندگی کر سکیں، کیونکہ ہم جو مسئلہ پیش کرنے آئے ہیں، وہ مذہبی ہے، اس لیے ہندوستان کے مذہبی طبقہ کی نمایندگی بھی ضروری تھی، ہمارے ساتھ اور بھی افراد آتے، لیکن وقت گذر رہا تھا، اس لیے اس پہلی جماعت ہی کو بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا، کچھ اور لوگ جلد ہی آئیں گے، اور بہت سے

لوگ اور بھی آسکتے ہیں، اگر ان کی سماعت ہو......

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم ترک تو نہیں ہیں، ترکوں سے ہمارا کوئی سیاسی تعلق نہیں، پھر ہم ترکوں کے ساتھ سمجھوتہ کرانے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں، ہم ترکوں کے وکیل نہیں ہیں، بلکہ ہم ہندوستانی دعویٰ کی وکالت کرنے آئے ہیں، ہم ترکوں کی خاطر بولنے نہیں آئے ہیں، ہم تو اپنے حق کو جتانے کے لیے آئے ہیں، ہم اس کی تصریح کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا مسئلہ صرف ترکوں کا نہیں، بلکہ اسلام کا ہے۔ اسلام جغرافیائی اور نسلی حد بندی کا قائل نہیں، موجودہ یورپ کی قومیت نے تو انسانی ارتباط اور انسانی ہمدردی میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے، اسلام قومیت کے بجائے مافوق القومیت کی تعلیم دیتا ہے، ہم ایسی قومیت کے مندر کے پجاری نہیں ہیں جہاں یہ مالا جپا جاتا ہو کہ ہمارا ملک چاہے صحیح یا غلط کام انجام دے ہم بہرحال اس کے حامی ہیں (تالیاں) گذشتہ جنگ عظیم میں انسان کا سارا ہنر انسانیت کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کی غارتگری کے لیے خرچ کیا گیا، اور یہ جنگ قومیت کے نام پر لڑی گئی، موجودہ قومیت کی شیطنت کو اب ختم کرنے کا وقت آگیا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک ترک محض ایک انسان نہیں ہے، بلکہ وہ ان کا بھائی ہے، وہ ایک ملک اور ایک مشترکہ نسل کے نہ سہی، کتوں اور گھوڑوں کی تفریق نسل کی حیثیت سے کی جاتی ہے، انسانوں کی تفریق اس طرح نہیں کیجاتی، زندگی سے متعلق ہمارا اور ترکوں کا مطمحِ نظر ایک ہے، ہم دونوں ایسے ادارے اور قوانین کے پابند ہیں جن سے ہمارے نقطۂ نظر میں ایسا اشتراک پیدا ہوتا ہے جو اسلام کا کلچر کہلاتا ہے، ترک اور ہم دونوں انسانیت کے فروغ کے علمبردار

بنائے گئے تھے، ہم دونوں تمام پیغمبروں کے وارث ہیں، یہ صحیح ہے کہ ہم جس مشن
کو لے کر آئے تھے۔ اس کی تکمیل میں ہم کامیاب نہیں ہوسکے ہیں، اور ہم پر خدا نے
جو اعتماد کیا تھا، اس کو ہم پورا نہ کرسکے ہیں، آپ ہم کو ملامت کرسکتے ہیں،
لیکن ہم کو جو مشن دیا گیا ہے وہ ملامت کے قابل نہیں.......

اسلام میں ایسے عقائد اور نظریات نہیں ہیں جن کی آڑ میں اور دوسرے
پیشوا انسانیت کو ستیاناس کرتے رہتے ہیں، اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات
ہے، ایک صحیح کردار کی مکمل تلقین ہے۔ ایک ایسی معاشرتی سیاست ہے جو انسانی
نسل بلکہ پوری تخلیق کی طرح وسیع ہے، اس کے دو مرکز ہیں، اس کا ایک مرکز تو
خلیفہ کی ذات میں ہے، اور دوسرا مکانی مرکز جزیرۃ العرب ہے، جو اسلام کی
مقدس سرزمین ہے، خلیفہ امیرالمومنین ہوتا ہے، اس کے حکم کی تعمیل ہر مسلمان
کے لیے اس وقت تک کے لیے لازمی ہے، جب تک یہ قرآن اور سنت کے خلاف
نہ ہو، اسلام کے خلیفہ کی حیثیت پوپ سے زیادہ بھی ہے اور کم بھی ہے، زیادہ اس
لحاظ سے ہے کہ اسلام دنیاوی اور مذہبی تفریق کا قائل نہیں، کم اس خیال سے ہے
کہ خلیفہ کی ذات کوتاہیوں سے بالاتر نہیں سمجھی جاتی ہے، اگر اس میں اور مسلمانوں
میں اختلاف ہوجائے تو پھر خدا کا حکم ہی ثالث بن جاتا ہے، اور آخری فیصلہ قرآن
اور سنت کے مطابق ہی کیا جاتا ہے، مسلمان خلیفہ کے رحم و کرم کا ماتحت نہیں ہوتا
ہے، اس کا ضمیر آزاد رہتا ہے، اگر خلیفہ کا کردار غیر اسلامی ہوجاتا ہے تو مسلمان
اس کو معزول کردیتے ہیں، اور اگر اس کا حکم اسلام کے مطابق ہوتا ہے تو اسلام
کی تعلیم ہے کہ اس کے حکم کی تعمیل کیجائے، اس طرح خلیفہ ہی نہ کہ کوئی اور حکمران

ہمارے مذہب کا علمبردار بن سکتا ہے،
ذرا مجھکو خلیفہ کی دنیاوی قوت کے متعلق کچھ وضاحت کردینی چاہیئے، اسلام محض
اتوار، یوم السبت اور جمعہ کی حد تک محدود نہیں ہے، خلیفہ صرف تسبیح پڑھنے
کے لیے مقرر نہیں کیا جاتا ہے، ہمارے مذہب کا دفاع بھی اس کا اصلی فرض ہے،
عیسائیت نے حضرت عیسیٰؑ کے وعظ کو سیاسی مفاد کی خاطر رد کر رکھا ہے، کمزور
عیسائیت دنیا کی سلطنت کی مالک نہیں بنی ہوئی ہے، پھر اسلام سے یہ کیسے توقع کی
جاسکتی ہے کہ وہ اپنے بائیں گال کو اس کے سامنے پیش کردے، جس نے اس کے دائیں گال
کو زخمی کیا ہے، مسلمانوں کے پاس جو کچھ ہوتا ہے چاہے وہ جسمانی قوت ہی کیوں نہ ہو،
وہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں صرف کیے جانے کے لیے ہے، اور اگر کوئی مسلمان اپنی کسی
چیز کو بھی اسلام کی حمایت میں استعمال کرنے میں گریز کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے مشن
کی خیانت کرتا ہے، اور اگر قوت کو انسانی مسائل کے حل کرنے کے سلسلہ کو بالائے طاق
رکھ دینے کا فیصلہ کرلیا جائے تو سب سے پہلے مسلمان اپنے اسلحہ اور تلوار کو ہل جوتنے میں
لگا دیں گے (تالیاں) لیکن آج ہم کیا دیکھ رہے ہیں، لارڈ برائس تو اپنے اتحادیوں کو
یہی تلقین کررہے ہیں کہ خلافت کے خلاف موٹا ڈنڈا استعمال کیا جائے، وہ کہتے ہیں کہ مشرق
کے لوگ اس کے علاوہ اور کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں، لیکن ذرا میں پوچھوں کہ مغرب کے
لوگ اس کے علاوہ اور کیا سمجھنے کے لیے تیار رہتے ہیں؟ ہم اتحادیوں کے متعلق تو کچھ نہ کہیں گے
لیکن جرمنوں، اسٹریا کے باشندوں اور بالشویکوں کے متعلق کچھ کہنے میں کم خطرہ ہے، کیا یہ
لوگ مغرب کے رہنے والے نہیں ہیں؟ وہ موٹے ڈنڈے کے علاوہ اور کیا جانتے ہیں، کیا
جرمنوں کو صلح کے لیے جو راضی کیا گیا ہے، اس میں لارڈ برائس کی زبان کی فصاحت و بلاغت

کارگر ہوتی ہے، یا اتحادیوں کے اور زیادہ موٹے ڈنڈے! (قہقہہ) ہاں، جب تک
آپ کے لارڈ برائس جیسے لوگ ہیں، اور جب تک آپ کے پاس موٹے ڈنڈے ہیں تو
ہم کو بھی کسی قسم کا موٹا ڈنڈا اپنے مذہب کے دفاع کے لیے چاہیے، تاکہ ہم اپنے کو ایسے
لوگوں کے غلبہ واستیلاء سے بچا سکیں جو ہمارے ضمیر کے لیے خطرناک بنے ہوئے ہیں،
(تالیاں) یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے خلیفہ کے لیے دنیاوی طاقت کے بھی خواہاں ہیں، آپ
اگر یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس طرح خوش رکھ سکتے ہیں کہ آپ
ترکوں کو صرف قسطنطنیہ میں محدود کر دیں اور خلیفہ وٹیکن کے پوپ سے بھی بدتر بنا کر
رکھیں، اور وہ [illegible] کا قیدی بن کر رہے، تو حضرات وخواتین! آپ کو [illegible]
اسلام بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے متعلق بہت کم معلومات
ہیں، یہ ذلت کبھی گوارا نہیں کیجا سکتی ہے، مسلمان فوجی اس منحوس جنگ میں جو شریک
ہو گئے ہیں، اس سے آپ مطمئن نہ رہیں، اور جو یہ شورش اور ہیجان بپا ہے، اس کو
آپ فرعونی اور خیالی نہ سمجھیں، آپ مسلمان فوجیوں کو اس پر مجبور نہ کریں کہ وہ آپ کے
جھوٹ کا پول کھولنے کے لیے ایسے اقدام کر بیٹھیں جو آپ اور ہمارے دونوں کیلیے
کڑوے ثابت ہوں، خبردار، خبردار (تالیاں)

ہندوستان کے مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ خلافت کے ساتھ اتنی دنیاوی قوت ہو کہ
اس سے ہمارے دین کی حفاظت ہو سکے، اس کے ساتھ ترکی سے یہ ضمانت لے لی جائے
کہ اس کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کو برقرار، تو ضرور رکھا جائیگا، لیکن اسکی حکومت
میں جو مختلف لوگ یعنی عیسائی، مسلمان اور یہودی ہیں، ان کو خود مختارانہ طور پر ترقی
کرنے کی اجازت ہوگی، ایسی مصالحت ممکن ہے، جو بہت اچھی تو نہیں، لیکن دوسرے درجہ

پر جو چیز اچھی سمجھی جاسکتی ہے، وہ یہ ضرور ہے، ترکی کے ساتھ بے رحمانہ سلوک صدیوں سے
کیا جا رہا ہے، اسی لیے یہ یورپ اور ایشیا میں اپنے بہت سے علاقوں سے محروم ہو گیا ہے،
طرابلس میں اس کے لیے جو کچھ ہوا، اس کو خود اتحادیوں نے شرمناک قزاقی کہا ہے،
اب ہم اعتدال پسندی کی خاطر اس بات کے خواہاں ہیں کہ بلقان کی جنگ کے بعد
ترکی کے پاس جو کچھ رہ گیا ہے، وہ رہنے دیا جائے، یورپ اور امریکہ کے مدبرین خصوصاً
مسٹر ولسن کا خیال تھا کہ جنگ عظیم کے بعد نئے آسمان اور نئی زمین دکھائی دے گی،
السس لورین اس کے اصلی حقداروں کو واپس کر دیا گیا ہے، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے
انصاف کا بول بالا ہوا ہے، اسی طرح جو علاقے ترکی سے لیے گئے ہیں، اگر ترکوں [illegible] واپس
کر دیے جائیں یا طرابلس کا جو حصہ عربوں سے چھین لیا گیا ہے، اگر ترکوں یا یہی عربوں
کو لوٹا دیا جائے، یا مصر کا وہ حصہ جو اس سے کاٹ لیا گیا ہے، اگر مصر کو دیدیا جائے تو کیا
اس سے انصاف کی صدا بلند نہ ہوگی، لیکن ہم یہ نہیں چاہتے، گرچہ ان علاقوں کو اپنے
بھائیوں کے حق خود اختیاری سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں، ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ
بہت ہی کم ہے، اور اگر وہ لوگ بھی جو مسائل کا جائزہ لیتے وقت کبھی دو متضاد قسم
کے معیار کو اپناتے ہیں، ہمارے اس مطالبہ پر غور کریں گے، تو اس کو معتدل پائینگے،
جنگ میں جرمنی کی قوت توڑ دی گئی، لیکن اتحادی ابتک مضبوط ہیں، کیا وہ ترکی
سے بھی خطرہ رکھتے ہیں، جو وہ جرمنی سے رکھتے تھے، ہم ایسا نہیں سوچ سکتے، انگلستان
بہت کچھ کھو چکا ہے، لیکن امید ہے کہ اس کی وہ حیثیت ضائع نہیں ہوئی ہے، جس سے
وہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر سکے، کیا اس کی سمجھ اتنی برباد ہو چکی ہے،
کہ وہ اپنی بقا ترکوں کی بربادی ہی میں تصور کرنے پر مجبور ہو جائے، اس طرح کے

وطیرے سے نہ امپائر بنائے جاتے ہیں اور نہ برقرار رکھے جاتے ہیں،

ہمارا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ فرات اور دجلہ کی چوتھی سرحد یعنی جزیرۃ العرب پر مسلمانوں کا اقتدار باقی رہے، ہم یہ بیکار سی بات تو سوچ نہیں سکتے کہ آپ خلافت کو برقرار رکھنے کے لیے خلیفہ کو کچھ اور سرزمین اپنی طرف سے دیدیں، لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ شام، فلسطین اور میسوپوٹیمیا عثمانی سلطنت کے اندر رہیں، یہ سارے علاقے بنجر ہیں، گو ہم اس دوری پر بھی اس نیل کی بو سونگھ رہے ہیں، جس کی خاطر آپ کی نظر خلیج فارس پر بھی اٹھی، ہماری مقدس ترین سرزمین ایک غیر ذی زرع وادی میں آباد ہے، لیکن اس سرزمین کے ریت کا ایک ذرہ بھی ہمارے لیے سونے کے سیکڑوں من سے زیادہ عزیز ہے، ہم حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، اور حضرت عیسیٰؑ کے جانشین ہیں، ہم ان کے لیے علیہ السلام کا جز اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح ہم اپنے آخری پیغمبر کے لیے صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں، ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ ہم اس مقدس سرزمین میں مذہبی حکومت اور توحید کو باقی رکھیں، اگر ترک اس علاقہ کے کسی حصہ پر غیر مسلموں کے تسلط کے لیے راضی بھی ہو جائیں تو ہم ہندوستانی اور دنیا کے اور مسلمان ان سے برسرپیکار ہو جائیں گے، اور اس سرزمین کے تقدس کی روایت کو برقرار رکھیں گے۔۔۔۔

جہاں تک عربوں کا تعلق ہے، دنیا کے مسلمانوں سے بڑھ کر ان کا اور کون ہمدرد ہو سکتا ہے (تالیاں) کیا ہمارے پیغمبر عرب نہ تھے؟ کیا کلام پاک اور حدیث کی زبان عربی نہیں ہے؟ کیا ہم مکہ کی طرف منہ کر کے پانچوں وقت کی نماز نہیں پڑھتے ہیں؟ اور مدینہ! یہ وہ سرزمین ہے جس نے ہمارے رسول اور ان کے صحابہ کو پناہ دی، اور

یہ وہ جگہ ہے جہاں قربانے کیلئے ہم خواہاں رہتے ہیں (تالیاں)۔ خواتین و حضرات! آپ ہم کو یہ باور نہیں کرا سکتے کہ اتحادیوں کی سپریم کونسل ہم سے زیادہ عربوں سے محبت رکھتی ہے، ترک بھی ہم سے عربوں سے زیادہ محبت کے خواہاں نہیں ہو سکتے لیکن یہ عربوں اور ترکوں کا سوال نہیں رہا، یہ تو اب اسلام کا سوال ہے (تالیاں) اسلام ہم لوگوں کو ترکوں اور عربوں سے زیادہ عزیز ہے، اور خود عرب اور ترک اسلام کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، عربوں کی خودمختاری کا سوال خود مسلمانوں پر چھوڑ دیا جائے، اور ہم کو اس میں کوئی مشکل نظر نہیں آتی کہ ایک وفاق میں عربوں کو ہر طرح کی خودمختاری حاصل ہو،

ہمارا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور میسوپوٹیمیا کی مقدس زیارت گاہیں خلیفہ کی نگرانی میں رہیں، یہ دعویٰ کہ جزیرۃ العرب مسلمانوں کے تحت رہے، ہمارے رسول کی آخری وصیت پر مبنی ہے۔ کلام پاک اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، برطانوی حکومت کے ساتھ ہماری وفاداری اس شرط کے ساتھ ہے کہ ہم کو اپنے مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل ہو گی۔ جب یہ شرط ہے تو ہم کو حق حاصل ہے کہ ہم اس کے لیے اصرار کریں کہ خلافت قائم رکھی جائے، جزیرۃ العرب پر عیسائیوں کو استیلا اور اقتدار حاصل نہ ہو، اور خلیفہ مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات کا محافظ ہو، وزیر اعظم کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ان جذبات کا احترام کیا گیا ہے، لیکن جب مسلمانوں کو ان کے مذہبی حقوق نہیں دیے جا رہے ہیں تو پھر ان کے جذبات کے احترام کا سوال کہاں آتا ہے، وزیر اعظم صرف یہ کہہ کر مسلمانوں کو تسلی دینا چاہتے ہیں کہ خلیفہ قسطنطنیہ میں

آرام سے رہے گا، لیکن وہ وہاں کیوں رہے؟ مسٹر لائڈ جارج، مسٹر بونرلا اور سر ایڈورڈ کارسن نے صاف طور سے یہ کہدیا ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں، مجھکو تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ روس کا زار اگر مستبدانہ روش اختیار نہ کرتا تو شاید وہ زار گراڈ کی طرح قسطنطنیہ پر بھی حکومت کرنے کا دعویدار ہوجاتا، پھر خلیفہ کو اسلام بول میں محدود کر کے مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا جاتا۔ بات یہیں پر ختم ہوتی نظر نہیں آتی، خلیفہ یہاں اس لیے رکھا جائے گا کہ اتحادیوں کی بندوقوں کی زد میں یرغمال بنا رہے، اور اسی سے گویا مسلمانوں کے جذبات کا احترام کا اظہار ہوگا، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کے احترام کیے جانے کے بجائے ان کی باتوں کو سننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی، آپ ان کے اخبارات کو بند کرادیں، ان کے رہنماؤں بلکہ ان کے مذہبی پیشواؤں کو جیل بھجوادیں، اور جب اس دہشت انگیزی سے لوگ خاموش ہوکر رہ جائیں، تو آپ یہ کہیں کہ آپ نے ان کی باتیں احتیاط اور سکون سے سن لی ہیں (تالیاں)۔ وزیر اعظم نے ہماری معروضات کے جواب میں جو کچھ کہا اس کا جواب بھی ہم کو دینے کی اجازت نہیں دی گئی، کیونکہ وقت ختم ہو گیا تھا، رات کا وقت تھا، جواب دینے میں رات ختم ہو جاتی، لیکن مسئلہ جب برسوں اور قرنوں کا ہو تو ایک رات کے ختم ہونے کا کیا اندیشہ ہونا چاہیے تھا، قتل اور خونریزی میں معلوم نہیں کتنی راتیں گذاری گئیں، جس کے بعد لوگ عدل اور انصاف کی روشنی پانے کے لیے اپنی نیند کو حرام کرکے بہت سی بیقرار راتیں گذار چکے ہیں، وہاں ایک رات کے ختم ہونے کا اندیشہ کہاں تک صحیح ہے (تالیاں)

خواتین و حضرات! آپ پوچھیں گے کہ آرمینیوں کے قتل کے متعلق ہمارا کیا خیال ہے، ہم اس کو نظر انداز کرنے کے قائل نہیں، اسلام آشتی اور امن کا مذہب ہے، ہم اسلام کی وکالت کیسے کر سکتے ہیں جب ہم دہشت انگیز واقعات کو نظر انداز کر دینگے، لیکن ہم کہتے ہیں کہ گذشتہ صدی کے آخری ربع سے پہلے ہم نے آرمینیا کے قتل کی خبر کبھی نہیں سنی، مگر اب وہاں کے قتل کی خبریں مشتہر کی جا رہی ہیں، اس کے اسباب ہم آپ کو بتائیں، روس، بلقان کے ترکی علاقے میں قتل کا بازار گرم کیے رہا، یہاں اس کی دھوکہ دھڑی [illegible] توقع سے بہت زیادہ مفید ثابت ہوئی، پھر تو اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کیا اچھا ہوتا کہ اس کو پٹروگراڈ سے پشاور تک ایک کھلا راستہ مل جاتا، اس منزل مقصود کو حاصل کرنے کے لیے اس کی نظر آرمینیا کی طرف اٹھی، آرمینیا میں اس وقت جو قتل ہوا اس کو ابھی نظر میں نہ رکھئے، بلکہ اس کو جاننے کی کوشش کیجئے کہ یہ قتل کب سے شروع ہوا؟ کیوں شروع کیا گیا؟ اسکے پہلے کیوں نہیں شروع ہوا؟ اس کے شروع کرانے میں کس کا ہاتھ تھا؟ اس سلسلہ میں اندر اور باہر کیا کیا سازشیں ہوئیں؟ قتل کیے جانے میں غیر مسلح امن پسند شہری تھے یا مسلح باغی تھے؟ اگر مسلح باغی تھے تو کیا ان کے ساتھ وہی سلوک نہیں کیا گیا جو اور جگہ ہوا کرتا ہے؟ کیا فوجوں کے ذریعہ سے غیر مسلح اطاعت گذار شہریوں کا خاتمہ کیا گیا یا ان مسلح باغیوں سے فوج لڑی جو رات دن برابر کی ٹکر لینا چاہتے تھے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آرمینی صلح کانفرنس میں اپنی نمائندگی کے خواہاں محض اس لیے ہوتے کہ وہ بھی لڑنے والے فریقوں میں سے تھے؟ کیا وہ اب بھی اس کا دعویٰ نہیں کر رہے ہیں کہ انھوں نے اپنی حکومت کے خلاف اتحادیوں کو مدد پہنچائی، اسلیے

وہ صلہ پانے کے مستحق ہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آرمینیوں کے قتل کی شہرت اس وقت کیجاتی ہے جب اتحادی ان علاقوں کے متعلق اپنا کوئی فیصلہ صادر کرنا چاہتے ہیں؟ کیا اس قتل کو شہرت دینے میں پس پردہ سرمایہ دار اپنی سرمایہ داری کی ایک بندرگاہ اور سامراجی طاقتیں اپنی فوجی گاڑی کیلئے سامراجی ریل کے راستہ کے خواہاں ہوتے ہیں؛ ہم ان مسائل پر کیا روشنی ڈال سکتے ہیں اور نہ ڈالکر نفس مسئلہ کے متعلق کچھ قبل از وقت کہنا چاہتے ہیں، ہم تو برابر اس کیلئے اصرار کر رہے ہیں کہ اس قتل کی تحقیقات کے لیے ایک غیر جانبدار بین الاقوامی کمیشن مقرر کیا جائے، اور اس میں کل ہند خلافت کانفرنس کی بھی مناسب نمائندگی ہو، کیا ہمارا یہ مطالبہ حق و انصاف کی خاطر ہے یا قاتلوں کی حمایت کے لیے ہے؟

اس غیر جانبدار کمیشن کے بغیر آپ کسی ایک مسلمان یا کسی ایک ہندوستانی کو قائل نہیں کر سکتے کہ آپ وہ رائے نہیں رکھتے ہیں جو آپ کے وزیر اعظم رکھتے ہیں، آپکے وزیر اعظم نے لارڈ ایلن بائی کو خراج تحسین پیش کرتے وقت کہا ہے کہ صلیبی جنگ کی یہ آخری کامیاب لڑائی تھی، اور جو لڑائی کئی صدیوں سے یورپ کی بہادری سے جیتی نہ جا سکی تھی، اس کے جیتنے کا سہرا برطانیہ کے سر پر ہے، ہم تو صلیبی جنگ کا ذکر نہیں کرتے، اس پر تو آپ کے وزیر اعظم کو فخر ہے،

خواتین و حضرات! ہماری باتیں آپ کے سامنے ہیں، اب آپ خود فیصلہ کریں کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے قتل اور غارتگری کرنے والی حکومت کی مدافعت ہوتی ہے، یا اس میں عدل و انصاف کو ابھارنے کی خواہش ہے، آپ ہماری باتوں سے اندازہ کریں کہ ہم یہاں ایک غیر وفادار رعایا کی حیثیت سے برطانوی حکومت کو دھمکی دینے آئے ہیں، یا وفادار رعایا کی حیثیت سے حکومت اور قوم کی توجہ اس طرف

دلانے آئے ہیں کہ اگر برے قسم کے صلحنامے ہوئے تو پھر کیا کیا خطرناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں، صلحنامے پر تو دستخط ہو جائیں گے، لیکن یہ صلح صلح نہ ہوگی، بلکہ آئندہ جنگ کا پیش خیمہ ہوگی، جس کے بعد انسانوں کے خون کی جنگ تو نہ ہوگی لیکن ضمیر اور عقائد کی سخت جنگ ہوگی، ہم دھمکی نہیں دیتے ہیں، ہم کرنل ویجوڈ کی باتوں سے متفق ہیں جن کی تقریر سننے کے لیے ہم دارالعوام گئے، ہم کو بھی یقین ہے کہ ہم انگریزوں کو دھمکی دیکر ان سے کچھ نہیں لے سکتے بلکہ انکو قائل کرکے ان سے کچھ حاصل کر سکتے ہیں، کرنل ویجوڈ جب یہ کہتے ہیں کہ ہم کس چیز سے دھمکی دے سکتے ہیں، تو ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم لڑائی کے طاقتور انجنوں سے تو دھمکی نہیں دے سکتے ہیں لیکن ہم آپ کو دھمکی دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں، اور یہ دھمکی حق و صداقت کے اسلحہ کی قوت پر دیتے ہیں جس کے لیے کوئی سپر نہیں، ہم اپنے اس ناقابلِ تسخیر ارادے کے سہارے دھمکی دے سکتے ہیں جو کسی ناانصافی کے ساتھ ضم نہیں ہو سکتے، ہم اس عزم کی طاقت کے بل پر دھمکی دے سکتے ہیں جو ہم کو تکمیل کے سلسلہ میں مرنا سکھاتا ہے (تالیاں) میں آج کے جلسہ میں برطانوی قوم کو مخاطب کر رہا ہوں، میں آپکے ذریعہ بادشاہ سلامت کے پاس بھی ایک پیام پہنچانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ کیا بادشاہ سلامت اپنی مسلمان اور ہندوستان رعایا کی وفاداری پر اعتماد کر سکتے ہیں، جب یہ رعایا اپنے تمام بادشاہوں کے بادشاہ (یعنی خدا) کی وفاداری سے منحرف ہو جائے گی (تالیاں) کیا بادشاہ سلامت غلاموں اور بزدلوں کی اسی قوم پر حکومت کرنا پسند کرینگے جو ایسی غیر منصفانہ صلح کو قبول کرلے جو اب صلح کانفرنس میں ہونے والی ہے ...... (تالیاں)

مولانا محمد علی کے بعد سید حسین بولنے کے لیے کھڑے ہوئے، انکی تقریر مختصر تھی لیکن دھمکیوں سے بھری ہوئی تھی، انھوں نے کہا کہ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان غیر مسلح ہیں،

ان کے ہموطنوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں ہیں، وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں، یہ سوال بڑا سیدھا اور سادہ ہے، تھوڑی دیر کے لیے مان لیجئے کہ ہم جواباً کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا حکومت برطانیہ اپنی رعایا کو اسی طرح دبا کر اپنی برطانوی دولت مشترکہ کو قائم رکھنا چاہتی ہے؟ کیا ہماری وفاداری اسی لیے ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے؟ آگے چل کر سید حسین نے کہا کہ میں برطانوی تاج کا وفادار بن کر رہنا چاہتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ مجھکو پوری مذہبی آزادی حاصل ہو، اور میں اپنے جسم کی روح کو اپنی روح کہہ سکوں (تالیاں)

اس کے بعد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ایک مختصر تقریر ہوئی، وہ ہندوستانی زبان میں بولے۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ ان علماء کے طبقہ کی نمایندگی کرتے ہیں جس نے سیکولر قسم کی شورش سے اپنے کو کبھی وابستہ نہیں کیا ہے، وہ اس ملک میں اس کے اثری، تاریخی اور قومی خزانوں کو دیکھنے کے لیے نہیں آئے ہیں، بلکہ اس مسئلہ پر اپنے طبقہ کے علماء کے ان مذہبی جذبات کی ترجمانی کرنے آئے ہیں جو دنیا کے مسلمانوں کے لیے موت و زیست کا سوال بنا ہوا ہے (تالیاں)

اس کے بعد مسٹر لے لینڈ بکسٹن کی تقریر ہوئی جس میں انھوں نے کہا کہ مجھکو تو ایسا معلوم ہوتا ہے مشرق قریب میں یونانیوں کا ایک امپائر قائم کیا جانے والا ہے (صدائے تحسین) میں یونانی سامراجیت کو دنیا کے اس حصہ کے امن کے لیے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں، یونانیوں کے حوصلے لامحدود بھی ہیں اور وحشیانہ بھی، میں وزیر اعظم کی اس بھول کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جسکی بنا پر انھوں نے دعویٰ کیا ہو کہ تھریس میں مسلمان اقلیت میں ہیں، یہ بالکل جھوٹ ہے پورے تھریس میں مسلمان بہت بڑی اکثریت میں ہیں لیکن تھوڑی دیر کیلئے مان لیجئے کہ یہ اعداد و شمار صحیح ہیں، تو پھر مسلمان اور بلغاری ملکر یونانیوں سے کہیں زیادہ ہو جاتے ہیں، یونانیوں کو مشرقی تھریس دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہاں کی آبادی کو اسکے بدترین دشمنوں کے حوالے کرنا ہے، میں اپنے ہندوستانی دوستوں سے کہوں گا کہ وہ وزیر اعظم کو ان کی

گمراہ کن باتوں کی طرف توجہ دلائیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر یونانیوں کو مشرقی تھریس دیدیا گیا تو پھر وہ مغربی تھریس کو بھی حاصل کرنے کیلیے طرح طرح کے دلائل پیش کرینگے۔

مسز سروجنی نائیڈو بھی اس جلسہ میں موجود تھیں، وہ بولنے کے لیے کھڑی ہوئیں، انھوں نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ میں ہندوؤں کی طرف سے کہہ سکتی ہوں کہ ہندو اس مسئلہ میں اپنے مسلمان ہموطنوں کا ساتھ مرتے دم تک دیں گے۔ خلافت کے تاریخی امپائر کے لیے اتحادیوں کی فتوحات کے نیچے کوئی مقبرہ بنایا گیا تو پھر اتحادیوں کو ہمارے مسلمان ہموطنوں کے لیے بھی مقبرہ بنانے کے لیے تیار رہنا چاہیے، لیکن جب ہمارے کروروں مسلمان ہموطن موت سے زیادہ بدتر صورت حال سے دوچار ہیں تو ہم ہندو الگ رہ کر ان کو بے سہارا چھوڑنا پسند نہ کریں گے۔ برطانوی باشندوں کو فخر ہے کہ ان کی حکومت رائے عامہ پر قائم ہے، تو کیا اس وقت عدل و انصاف کا جو مذاق اڑایا جا رہا ہے، اس کے وہ صرف تماشائی بن کر رہنا پسند کریں گے؟ کیا آپ یہ دیکھنا پسند کرینگے کہ آپ اپنی آزادی کی عظیم روایت کو جھٹلا رہے ہیں؟ کیا آپ علحدہ کھڑے ہو کر ایک بڑے امپائر کو ختم ہوتے ہوئے دیکھنا گوارا کریں گے اور اس امپائر سے چھوٹے چھوٹے علاقے بنائے جانے پر مطمئن ہو جائیں گے؟ آپ حق خود اختیاریت اور آزادی کی باتیں کرتے ہیں، ہم بھی تو حق خود اختیاریت اور آزادی کی آواز بلند کرتے ہیں، لیکن آپ اس کو دبا رہے ہیں، کیا عیسائیت کے لیے علحدہ قانون ہے اور غیر عیسائیوں کے لیے علحدہ اصول ہیں؟ اگر آپ خلافت کے امپائر کو توڑنا چاہتے ہیں تو دوسرے امپائر کو بھی مسمار کریں، پھر ان ہی مسمار شدہ امپائر سے دنیا کی جمہوریتیں بنائی جائیں گی۔

اس جلسہ میں تقریر کرنے والوں میں مسٹر آرنلڈ لپٹن بھی تھے، انھوں نے کہا کہ عقلمندی کا تقاضا

یہ ہے کہ عثمانی سلطنت کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، وہ اور دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں کسی صورت سے برے نہیں ہیں، یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ اور سب سے اچھے ہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے لیے ہم سے زیادہ برا ہونا ممکن نہیں، انگریز بہت ہی اچھے اور بہت ہی چالاک ہوتے ہیں لیکن ان میں کچھ لوگ بہت ہی بدمعاش بھی ہیں، عثمانیوں نے ہماری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا ہے، وہ ہم سے مدد کے طلبگار ہیں، گرچہ انکو ہماری مدد لینے میں کوئی فخر کی بات نہیں ہے، ہم ان سے لڑ چکے ہیں، لیکن اب ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ انکے ساتھ ملکر کام اور تجارت کریں۔

اس جلسہ میں ڈاکٹر عبد المجید ام، ٹی قادر بھائی اور مسٹر بی، جی، ہارنی مین نے بھی تقریریں کیں، جلسہ بڑے جذباتی جوش و خروش سے ختم ہوا،

ایسکس ہال کے اس اجتماع سے پہلے مولانا محمد علی نے اپنے وفد کے ارکان کے جذبات سے تار کے ذریعہ سے امریکہ کو بھی آگاہ کیا تھا، کیونکہ وہ گذشتہ جنگ عظیم میں اتحادیوں کا حامی تھا، فرانس بھی اتحادیوں میں تھا، اسلیے مولانا محمد علی اپنے وفد کے ساتھ پیرس بھی گئے تھے، ۱۴ر مارچ ۱۹۲۰ء کو اس وفد کا خیر مقدم موسیو برٹلی نے کیا جو فرانس کے وزیر خارجہ تھے، اسکے بعد سیلی ہوشے میں ایک عام جلسہ اکم بولیس روشے کی صدارت میں ہوا جس میں شام کے مشاہیر کے علاوہ ٹیونس، چین، روس اور مصر کے کچھ مسلمان بھی شریک تھے، اس میں مولانا محمد علی اور سید حسین نے انگریزی میں تقریریں کیں، اور وہی باتیں کہیں جو انگلستان میں کہہ چکے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے عربی میں تقریر کی، جس کا فرانسیسی ترجمہ ٹیونس کے ایک مسلمان نے کیا، صدر جلسہ کے علاوہ پیٹ پال بلوسین، جین میلا اور لاکو نیر کی بھی تقریریں ہوئیں، اور ایک تجویز کے ذریعہ وفد کے کاموں کے ساتھ دوستی اور ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔

(باقی)

کیا اسلامی قانون رومی قانون کا مرہون منت ہے،

ترجمہ

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، پیرس

(۴)

(۲۷) چونکہ [رومی قانون کے فقہ پر اثر کے سلسلے میں] گولڈ سیہر کا ممتاز نام پیش کیا جاتا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے بیانات اور پھر ان کے جوابات کو بہ ترتیب پیش کیا جائے۔

(۱) "اسلامی علم قانون دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوا"

(۲۸) اس واضح اور متفقہ روایت کو ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی جسمیں یہ بیان ہوا ہے کہ [دوسری صدی ہجری کے بہت پہلے] اسلامی قانون وراثت کو تفصیل سے elaboration خلفائے راشدین کے زمانے میں یعنی آنحضرت صلعم کی وفات کے تین ہی سال کے اندر زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری، عمر بن الخطاب اور علی بن ابی طالب [رضی اللہ عنہم] نے مرتب کر دیا تھا،[1] یہ سب کے سب صحابی ہیں،

---

[1] قانون وراثت بڑی جامع تفصیل سے قرآن مجید میں مذکور ہے، مذکورہ صحابہ تقسیم ترکہ کی حساب دانی کے لیے مشہور تھے، نہ کہ اس قانون کے بنانے والوں کی حیثیت سے، (مترجم)

(۲۹) اس سلسلے میں شلڈن آموس کا بیان ہے کہ صحابہ کو اس کام کی "نہ فرصت تھی، نہ ان میں مطلوبہ ذہنی صلاحیت تھی، اور نہ وہ ایسے لوگ تھے جن کی ضرورت تھی" تاکہ ایک نفیس ترقی یافتہ قانون کی عمارت کھڑی کریں۔ یہ بیان جتنا ہمہ گیر ہے اتنا ہی غلط بھی ہے، مکے اور مدینے کے لوگ پیغمبر اسلام کے صدیوں قبل سے شہروں میں زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے تھے، اور وہاں وہ سب چیزیں تھیں جو حضری زندگی کے لیے ضروری ہوتی ہیں، فقہا اور علمائے دین کا امیروں [حاکموں] اور سپہ سالاروں سے الگ رہنا ایک ایسا واقعہ ہے جو اسلام کی ابتداء ہی سے پایا جاتا ہے، [حضرت] "عمر کے ہدایات قاضی کو"[1] [بنام حضرت

---

[1] [Omar's Instruction to the Qadi کے عنوان کے مضمون میں] مارگولیوث نے انگلستان کی انجمن مستشرقین کے سہ ماہی رسالے جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ۱۹۱۰ء کی جلد میں صفحہ (۳۰۷) وما بعد پر [حضرت] ابو موسیٰ اشعریؓ کو دی ہوئی ان ہدایتوں کا [انگریزی میں] ترجمہ کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وثیقے کی صحت کے متعلق مارگولیوث کی رائے بدلتی رہی ہے، مذکورہ رسالے کے ۱۹۱۰ء میں اس نے اس کی صحت کا محتاط الفاظ میں اعتراف کیا ہے لیکن راقم الحروف [فٹز جیرالڈ] سے اسکے کئی سال بعد اس نے اس سے بہت زیادہ پرزور الفاظ میں اسکی صحت کی تائید میں اپنی رائے ظاہر کی تھی۔ (مترجم) — راقم الحروف (محمد حمید اللہ) نے اس موضوع پر ایک مفصل مضمون پاریس کے ماہوار رسالے "فرانس اسلام" France - Islam کے شمارے ۳۱ تا ۳۵ (۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء) میں فرانسیسی میں شائع کیا، پھر مزید نظر ثانی و اصلاح کے بعد انگریزی میں جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنوری ۱۹۷۱ء کے شمارے میں چھپوایا اور لوگوں کے آراء کی تحلیل کے علاوہ اس میں مارگولیوث کا بھی خاصا ذکر ہے، مارگولیوث نے اپنا مضمون شروع تو کیا اس ہدایت نامے کو جعلی قرار دینے کے لیے، لیکن لفظ "قیاس" کا اس ہدایت نامے میں ذکر دیکھ کر اسے خیال آیا کہ یہ عبرانی لفظ "ہقش" سے ماخوذ ہوگا — اگرچہ قیاس کا مادہ عربی میں "قیس" ہے جسکو "ہقش" سے کوئی تعلق نہیں اور عبرانی میں ہقش کے معنے تصادم کے ہیں — اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ حضرت عمرؓ کو کسی یہودی نے یہ ہدایت نامہ مرتب کر دیا ہوگا، اس فرضی یہودی اثر کی دریافت پر وہ اتنا آپے سے باہر ہو گیا کہ ہدایت نامہ اس کی رائے میں صحیح ہو گیا۔ مترجم)

ابو موسیٰ الاشعریؓ] اگرچہ صرف زبانی روایت[1] کی صورت میں محفوظ رہی ہیں، لیکن یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ صحیح ہیں، اور ان کے مندرجات رومی قانون سے نہیں بلکہ ربیون کے یہودی قانون سے ماخوذ ہیں، جیسا کہ مارگولیوث نے بیان کیا ہے کہ اس ہدایت نامے کے لکھنے والے [حضرت عمرؓ] کے پہلو میں ایک یہودی قانون پیشہ موجود تھا"۔ اس ہدایت نامے میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس طریقہ تفکر کا ذکر ہے جن کے متعلق اس ابتدائی زمانے کے مسلمان حاکم عدالت سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اس کو اپنا رہبر بنائے گا، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلامی قانون اسی کے مطابق مرتب و مدون بھی ہوا ہے، اسلامی قانون کے ابتدائی مولف اور معلم جن کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں یعنی چاروں سنی مذاہب کے امام اگرچہ دوسری صدی ہجری کے ہیں،[2] لیکن یہ یقینی ہے کہ بہت بڑی مقدار میں قانونی تالیف کا کام ان سے پہلے ہو چکا تھا، یہ مولفین بعض تفصیلات میں باہم اختلاف رکھتے ہیں، لیکن قانون کا بنیادی خاکہ سب کے ہاں ایک ہی ہے، تفصیلات میں اس طرح کا اختلاف اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ بنیادی اساس مستحکم طور پر ڈال نہ دی گئی ہو، اور یہ اساس شام یا مصر، یا خود بغداد میں نہیں ڈالی گئی، جیسا کہ شلڈن آموس کا خیال ہے، بلکہ مدینہ منورہ اور کوفے میں ڈالی گئی، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں،

(۲) "عربی لفظ فقہ کے متعلق یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ وہ لاطینی لفظ Prudentia کا ترجمہ ہے، دونوں کے معنے معقولیت Reasonableness کے ہیں۔"

---

[1] اسکا اصل وثیقہ صدیوں مرسل الیہ کے خاندان میں محفوظ رہا، "زبانی" روایت کہنا درست نہیں۔ (مترجم)

[2] امام ابو حنیفہ اور امام مالک کی وفات دوسری صدی ہجری میں ہوئی۔ امام شافعی اور امام ابن حنبل کی تیسری صدی میں۔ (مترجم)

(۳۰) یہ جملے لکھنے کے بعد [گولڈ سیہر نے] دائرۂ معارف اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) میں "فقہ" پر جو مقالہ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا جملے میں "معقولیت" اس کے [ہنگری لفظ کا] غلط ترجمہ ہے، گولڈ سیہر کی مراد اس سے استعقال یا ملکۂ استدلال کا استعمال Raciocination, The use of reasoning faculty ہے، بعض ابتدائی عرب مولفین "فقہ" یعنی ملکۂ استدلال کو "علم" یعنی وحی Revelation اور حدس intuition کے ذریعے سے حاصل ہونے والی واقفیت Knowledge کے برعکس چیز کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وینسنک wensinck نے ["فقہ" کا ترجمہ] insight [یعنی داخلی نظر و واقفیت] کیا ہے، جو پرانی عربی، نیز لاطینی سے قریب تر ہے، لیکن اس سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ [لاطینی سے] براہ راست مستعار لی ہوئی اصطلاح نہیں ہے، بلکہ وہ چیز ہے جس کے متعلق مذکورۂ بالا کتاب میں سانتلانا Santillana نے [فرانسیسی میں] صحیح کہا ہے کہ: l'identite essentielle de l'esprit humain یعنی وہ "انسانوں کے فکر کی بنیادی یکسانیت" کے باعث ہے،

(۳۱) حقیقت میں سارے ہی قانونی نظام ناگزیر طور پر عقل اور استدلال reason کے استعمال پر مبنی ہوتے ہیں، کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ کوئی ایسا قانون پیشہ شخص بھی ہو سکتا ہے جسے اس کا شعور نہ ہو کہ اس کے پیشے میں ملکۂ استدلال کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے؟ کہا تو یہ بھی جا سکتا ہے، اگرچہ یہ احمقانہ بات ہوگی، کہ سنسکرت کے الفاظ "نیایا" (منطق) اور "میمانسا" (تعبیر و تاویل) — جو ہندو قانون میں ہندو مکاتب فلسفہ کے طریقۂ بحث کو داخل کرتے ہیں — روما سے تعلق ظاہر کرتے ہیں۔

(۳۲) یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ عربوں کے لیے لاطینی سے براہ راست کوئی چیز مستعار لینے کا موقع نہ تھا[1]، اور "قانون کو جاننے" juris prudens کے لیے یونانی لفظ پرونی موس pronimos (مالک قانون) نہیں ہے، بلکہ "نومی کوس" nomikos (یعنی قانونی بصیغۂ اضافت) یا "اسخولاسطیکوس" Scholastikos (تدقیق کنندہ) ہے،[2] گولڈ سیہر کے اس خیال کی صحیح قدر و قیمت کا جاننا مشکل ہے کہ "اس کا مماثل عبرانی لفظ بھی مماثل معنے رکھتا ہے"[3]، لیکن ایسا ہو بھی تو ربّی (یہودی) قانون کے ماہروں نے فہم انسانی کا استعمال روما سے نہیں سیکھا تھا۔

---

[1] غالباً یہ مراد ہے کہ مسلمان بزنطینی یونانیوں کے ہمسایہ تھے، لاطینی روما کے نہیں لیکن حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے ہی میں نہ صرف شمالی افریقہ بلکہ اسپین پر بھی مسلمان جزءً قابض ہو چکے تھے، امویوں نے مغربی یورپ میں بہت سی فتوحات حاصل کیں، اور یہاں لاطینی ہی بطور علمی زبان کے رائج تھی، اس طرح تاثیر کے امکان کی حد تک مسلمانوں کے لیے یونانی اور لاطینی میں کوئی فرق نہ تھا، یہی حال سنسکرت کا ہے کہ خلافت فاروقی ہی سے مسلمان سندھ اور گجرات میں پہنچ چکے تھے (مترجم) [2] جسٹی نین کی کتاب "خلاصہ" (ڈائجسٹ ۱/۳/۲) میں ڈیموستھینس Demosthenes کا ایک اقتباس ہے جو ارسطوجیتون کی رائے کی تردید Contra Aristogeitonem کے لیے ہے، بادی النظر میں اسلامی قانون کے تصورات سے ایک مماثلت کا حامل ہے، ڈیموستھینس [یونانی میں] بیان کرتا ہے کہ قانون ایک کلمۂ طیبہ ہے جو خداؤں کا عطیہ ہے۔ کتاب "خلاصہ" کے عیسائی کاتبوں نے تبدیلی کر کے اسے بصیغۂ واحد "خدا کا عطیہ" کر دیا۔ جو نتائج کی بصیرت رکھنے والے لوگوں کی ارادے حاصل ہوتا ہے، "لیکن یہ مماثلت محض سطحی ہے، کیونکہ "نتائج کی بصیرت رکھنے والے" یہاں کسی علمی اصطلاح کے طور پر نہیں بلکہ لفظ "لوگوں" کی صفت کے طور پر، اور ڈیموستھینس کا لفظ "ڈوگما" dogma "تعلیم" کا مفہوم نہیں رکھتا ہے، جو کلیسا نے اب اسے دے رکھا ہے اور جو اسے لفظ "فقہ" کا اچھا ترجمہ بنا دیتا ہے، یونانی جملہ "الکتاف" اور "خداؤں کا عطیہ" میں اور سامی قوموں [یعنی یہودی و اسلامی، (مترجم)] کے تصور قانون میں کہ وہ امر خداوندی کا نام ہے، فرق کی ایک پوری دنیا پائی جاتی ہے۔ (مؤلف)

(۲۶) میرے فاضل رفیق کار مسٹر وارٹشکی Wartski نے جو کا بیان ہے کہ یہودی لفظ حاخام [یعنی حاکم] مفہوم کے لحاظ سے یونانی لفظ "اسخولاسطیکوس" (یعنی تدقیق کنندہ) سے قریب تر ہے، بہ نسبت لاطینی لفظ "پروڈنس" prudens کے جس کے معنی ہیں اندرونی نظر رکھنے والا شخص، ایک مدراس [یعنی توریت کی تشریح] بھی پائی جاتی ہے، (دیکھو کتاب تکوین پر مدراس ربہ Midrash Rabbah (۲۲) جس میں شہنشاہ ہاڈریان Hadrian کے زمانے کے رومی افسر ربی (یہودی) قانون کے ایک بڑے ماہر کو "توریت کے اسخولاسطیکوس" کے نام سے یاد کرتے بیان کیے گئے ہیں (مؤلف) [3] غیر منصوص قانون کے لیے گولڈ سیہر نے اگر کوئی نام

(باقی ص ۱۹۰ پر)

(۳۲) [احکام فقہ کا] دو قسموں یعنی لکھے ہوئے leges scriptae اور نہ لکھے ہوئے leges non scriptae میں منقسم ہونا رومی قانون سے ماخوذ ہے۔"

(۳۳) اس بیان میں "نص" کو — جو مستند قانونی عبارت [یعنی قرآن و حدیث] کے معنی رکھتا ہے، "لکھے ہوئے قانون" Lex scripta کا مترادف قرار دے لیا گیا ہے، گو لٹ سیہر کے مضمون میں دوسری قسم [یعنی بن لکھے قانون] کا [عربی] نام تو نہیں دیا گیا ہے، مگر اس کی مراد "قیاس" سے ہے ۲۷/الف

(۳۴) لکھے ہوئے jus scriptum اور نہ لکھے ہوئے قانون jus non scriptum میں جو فرق ہے وہ جسٹی نین کی کتاب "عہود" (انسٹی ٹیوٹس ۱/۲/۳) میں بیان ہوا ہے، لکھا ہوا قانون وہ ہے جس کا رسمی وجوب formal validity اس لیے ہوتا ہے کہ اسے کوئی قانون ساز فرد یا گروہ معین طور پر وضع کرتا ہے، بن لکھا قانون وہ ہے جس کا وجوب محض قدیم زمانے سے پائے جانے والے رسم و رواج کے باعث ہوتا ہے، اس کے برخلاف نص اور قیاس میں فرق یہ ہے کہ نص ایک اساسی قانون ہے، اور قیاس میں اہل علم نص سے کوئی منطقی استنباط کرتے ہیں، لکھے ہوئے اور بن لکھے قانون، اور نص و قیاس میں سوا اس کے کوئی چیز مشترک نہیں کہ ان دونوں میں قانونی احکام کی تقسیم یوں کی گئی ہے کہ ایک وہ قانون ہے جس کا وجوب لفظ بہ لفظ ہوتا ہے، اور دوسرا وہ ہے جس کے لفظ پہ نہیں بلکہ جس کی روح (مفہوم

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۹) نہیں دیا تو اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس میں صرف قیاس ہی نہیں بلکہ استدلال، اجتہاد، استنباط، استحسان، استصلاح، استمرار سنن انبیاء، سلف وغیرہ بکثرت چیزیں داخل ہوتی ہیں (مترجم)

پر عمل واجب ہوتا ہے۔[1] یہ ایک فطری ارتقا ہے، اور ایسے نظام ہائے قانون میں بھی پایا جاتا ہے جن میں روما سے ماخوذ ہونے کا کوئی سوال نہیں، مثلاً انگلستان میں عام و شائع قانون Common law اور قانون موضوعہ Statute میں ایسا ہی فرق ہے، یا وہ تدریجی فرق جو ہندو قانون کے سرتی Sruti اور اسمرتی Smirti میں ہے، پھر اسمرتی اور نبندھا Nilandha میں بھی پایا جاتا ہے،

(۳۵) علماء کے جوابات (فقہا کے فتاوی، responsa prudentium) کو، جو رومی قانون کا ایک جزو ہیں، جسٹی نین نے "لکھے ہوئے قانون" میں داخل کیا ہے، اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ رومی "قانون اقتباسات" lex citationem نے

[1] یہ کہنا درست نہیں معلوم ہوتا کہ فقہ میں نص کا وجوب لفظ بہ لفظ ہوتا ہے، اور فقہا کے قیاسات میں لفظ پر نہیں بلکہ معنوں پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے، ہماری ناچیز رائے میں دونوں ہی پر لفظ بہ لفظ عمل کرنا واجب ہے، فرق یہ ہے کہ نص صرف ایک ہوتی ہے، اس کا وجوب ابدی ہے، اور اس کا انکار کرنے والا کافر ہے، اسکے برخلاف قیاسات ایک ہی مسئلے میں متعدد بلکہ متضاد بھی ہو سکتے ہیں، اور اختلاف مذاہب میں (جو بسا اوقات خود ایک مذہب اور ایک مکتب فقہ کے اندر بھی ہوتا ہے) باہم تکفیر نہیں کیجاتی، اور کسی سابقہ فقیہ کا قیاس بعد کے بزرگ تر فقیہ کے قیاس کے باعث غیر مرجح قرار پاکر نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے، دوسرے الفاظ میں نص کا وجوب یقینی اور قطعی ہے اور قیاس میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے، کیونکہ نص خدا اور نبی معصوم کیجانب سے ہوتی ہے اور قیاس غیر معصوم انسانوں کیجانب سے، اس مثال سے اسکی وضاحت ہوگی، حنفی مذہب میں پانی کے جانوروں میں سے صرف مچھلی کا کھانا جائز ہے، اور جھینگا ناجائز، شافعی مذہب میں جھینگا بھی حلال ہے، اس حرام و حلال کے باوجود حنفی اور شافعی ایک دوسرے کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ متاخر احناف جھینگے کو حلال قرار دیدیں اور سابقہ حنفی قیاس غیر مرجح سمجھا جانے لگے۔ — مترجم)

فتووں کو قانون موضوعہ Statute law کے برابر موثر قرار دیا ہے، نیز اس
لیے کہ ساری کتاب "خلاصہ" (ڈائجسٹ) [جو علماء کے آراء پر مشتمل ہے] قانون موضوعہ تھی،
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قانون روما کے ایک قدیم تر زمانۂ ارتقاء میں فتووں کو بن لکھا قانون
سمجھا جاتا تھا۔[1] اگر ہمارا یہ گمان صحیح ہے تو رومی قانون میں لکھے ہوئے اور بن لکھے ہوئے
قانون میں جو فرق ہے وہ قانون اسلام کے [نص و قیاس] کے فرق سے قریب تر
ہوگا، کیونکہ قانون اسلام کے دورِ تدوین سے بہت عرصہ بعد تک علماء کے استنباطات
کو "نص" نہیں سمجھا جاتا تھا، اور اسلامی قانون میں ایسی کوئی چیز نہیں جو رومی قانون
کے "لیکس" Lex (یعنی قانون شہنشاہی)، "پلے بی سیتاس Plebiscitas
(قانون بر استشارۂ عوام)، "سیناتس کونسولتا Senatus consulta (مجلس
حکومت کے فیصلے)، "پرین کی پیوم پلاکیتا" Principium placita: اور "ماگستراتوم
ایدکتا" magistratum edicta (مجسٹریٹ کے حکمناموں) کے جن کا جسٹی نین نے
اپنی تقسیم قوانین میں ذکر کیا ہے، مماثل ہو، اسی طرح قانون روما میں ایسی کوئی چیز نہیں جو
اسلامی قانون کے اس دعوے کے مماثل ہو کہ وہ احکام الٰہی کا نام ہے، جس پر اسلامی
نظام قانون قائم ہے، اسلامی قانون کے مستند احکام (نص) صرف قرآن پر مبنی
نہیں ہیں، اور خود قرآن اس لیے واجب العمل نہیں کہ وہ لکھا ہوا ہے، بلکہ اسلیے
کہ وہ خدائی وحی پر مشتمل ہے ــ بلکہ اس میں حدیث (جو اسلام کے آغاز سے ڈیڑھ سو
سال تک قلمبند نہیں کی گئی[2]) اور اجماع بھی شامل ہے (جو علمائے قانون یا ساری

[1] دیکھیے کتاب ڈائجسٹ ۱/۲/۲/۱۲ میں پومپونیوس Pomponius (مؤلف) [2] یہ بیان صحیح نہیں، بہت سے صحابہ نے
حدیث کو عہد نبوی ہی میں قلمبند کرنا شروع کر دیا تھا، بعض نے بعد میں یا تو خود لکھا یا لکھوایا، اس کے متعلق کچھ معلومات
علامہ شبلی کی سیرۃ النبی ج اول میں ملیں گے، کچھ تفصیل میری کتاب "صحیفۂ ہمام بن منبہ" (خاکسار کے
انگریزی ترجمے) کے مقدمے میں ہے۔ (مترجم)

امت کے عام اتفاق کا نام ہے)۔ شہنشاہ یولیان Julian (دیکھو کتاب ڈائجسٹ
۱/۳/۳۲) پوچھتا ہے کہ "اس کی کیا اہمیت ہے کہ قوم اپنی خواہش کا اظہار ووٹ کے ذریعے
سے کرے، یا خود اشیاء و اعمال میں؟" "لیکن اگر کوئی رواج اتنا قوی ہو کہ اسے قوم کی
خواہش کا غیر مشتبہ اعلان قرار دیا جا سکتا ہو تو وہ اسلامی قانون میں اجماع الامت ہے
اور اسی لیے وہ ایک "نص" ہے۔[1] ایک کہاوت ہے کہ "زبانِ خلق نقارۂ خدا" Vox
populi vox Dei (عوام کی آواز خدا کی آواز ہے)، لیکن یہ رومی قانون کا کبھی کوئی کلیہ
نہ رہا، البتہ ان معنوں میں اسلامی قانون کا ایک کلیہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف منسوب
ایک قول کی بنا پر یہ قرار دیا گیا ہے کہ جو بات سارے مسلمان متفقہ طور پر قبول کریں، یہ
اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا کی ہدایت ہے۔[2] جو رواج اس سے کم متفقہ ہو، وہ
محض رواج ہونے کی بنا پر قانون بالکل نہیں سمجھا جاتا، بجز متاخر مالکی مذہب کے،[3] اگرچہ

[1] معلوم نہیں کس حد تک قابل قبول ہے کہ اجماع کو نص سمجھا جائے۔ اجماع بے شک واجب العمل ہے، اور قرآن و حدیث
کے برابر سمجھا جاتا ہے، بشرطیکہ ان دونوں پر مبنی ہو، اس کے خلاف اجماع قابل تبدیل چیز ہے، جیسا کہ اصول
بزدوی میں صراحت سے بیان ہوا ہے کہ جدید تر اجماع قدیم تر اجماع کو منسوخ کر سکتا ہے۔ (مترجم)
[2] معلوم اس سے کس حدیث کی طرف اشارہ ہے، "لا تجتمع امتی علی ضلالۃ" (میری امت کسی گمراہی پر کبھی متفق
نہ ہوگی)، "ما رآہ المسلمون حسناً فهو عند الله حسن" (جو مسلمانوں کی نظروں میں اچھا ہو وہ اللہ کے
نزدیک بھی اچھا ہے)، "ید الله مع الجماعة" (جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے) حدیث میں بے شک ملتے
ہیں، لیکن مؤلف کا بیان ان میں سے کسی کا لفظی ترجمہ نہیں۔ (مترجم)
[3] فٹز جیرالڈ کی انگریزی کتاب Mohammedan Law "قانون محمدی"
صفحہ (۱۴)

قانون کے ماتحت وہ واجب العمل ہو سکتا ہے،

(۳۹) اس سلسلے میں گولٹ سیہر نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ لکھے ہوئے اور بن لکھے قانون میں جو فرق ہے وہ اسلام سے تقریباً پچاس سال قبل یہودیوں نے رومی قانون سے لیکر ربیوں کے قانون میں داخل کر دیا تھا، لیکن یہ فرق فی الحقیقت "ہمارے رب[1] [نعوذ باللہ] کے زمانے میں بھی موجود تھا، اور اس وقت [یہودیوں کو] رومی تسلط سے جو نفرت تھی اس کے باعث ایسی کوئی تاثیر عملاً ہو نہیں سکتی تھی[2]۔ گولٹ سیہر کے ذہن میں بہ ظاہر یہودی عقائد کا ایک متاخر تغیر تھا کہ بن لکھے قانون کو بھی لکھے ہوئے قانون کے برابر توریت کا جزء سمجھیں اور یہ مانیں کہ وہ بھی [حضرت] موسیٰؑ پر جبل حورب Horeb (یعنی طور سینا) پر نازل ہوا تھا، لیکن یہ بالکل غیر رومی تصور ہے،

(۴۰) "جس طرح روما کے اہل قانون کی رائے opinion میں "علمائے قانون کی رائے" بہت وزن دار چیز تھی، اسی طرح مسلمان فقہاء نے بھی یہ امتیازی حق حاصل کر لیا کہ ایک واجب العمل موضوعی [شخصی] رائے ظاہر کر سکیں، عربی اصطلاح "رائے" لاطینی اصطلاح opinio کا لفظی ترجمہ ہے۔"

---

[1] یعنی حضرت عیسیٰؑ اس لفظ our Lord کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے عیسائی مذہب قبول کرنے کا اعلان کر دیا تھا، اسی لیے پیدائشی عیسائیوں سے زیادہ زور و شور سے اس کا اظہار کرتا ہے۔ (مترجم)

[2] دیکھو انجیل متی باب ۲۵، جملہ ۲، اور انجیل مرقس باب ۷، جملہ ۵ تا ۱۳، جن میں ہے کہ "خدا کی بات کو تم اپنے رواج کے باعث بے اثر بنا دیتے ہو۔" (کامل عبارت ۱۵/۱ تا ۳ میں یوں ہے: "فریسی لوگ اور کاتبان توریت یروشلم سے یسوع کے ہاں آئے اور پوچھا: ایسا کیوں ہے کہ تیرے تبع پرانے لوگوں کے عملدرآمد پر دست درازی کرتے ہیں؟ کیونکہ وہ کھانا کھاتے وقت ہاتھ نہیں دھوتے! جواب دیا: اور تم اپنے عملدرآمد کی خاطر اللہ کے احکام پر کیوں دست درازی کرتے ہو؟... مرقس کے ہاں قصہ زیادہ تفصیل سے ہے، اور وہاں جملہ ۸ تا ۹ یوں ہے: "تم اللہ کے حکم کو نظر انداز کرتے ہو اور انسانوں کے عملدرآمد کو ملحوظ رکھتے ہو، اور یہ بھی فرمایا: تم بے تردد اللہ کے حکم کو باطل قرار دیتے ہو تاکہ اپنے عملدرآمد کی حفاظت کر سکو۔" (مترجم)

(۳۸) مگر یہ ایک تاریخی غلط فہمی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی انانیت کی وجہ سے جسٹی نین نے [لاطینی میں] یہ کہا ہے کہ tam conditor quam interpres legum solus imperator (یعنی صرف شہنشاہ ہی بہ یک واضعِ قانون اور تعبیر کنندۂ قانون ہے[1])۔ گویا یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کی دریافت کا سہرا اس کے سر ہو، حقیقت میں وہ کم از کم دقیانوس (دقلطیانوس[2] Diocletian فوت ۳۰۵ء) کے زمانے سے معلوم تھی، کیونکہ اس وقت ممتاز اہل قانون کا اثر قانون کی نشو و نما کے لیے شہنشاہ کے نام سے شہنشاہی مجلس شورائے راز Privy council میں ڈالا جانے لگا تھا، عہد زریں میں ماہر قانون پاپی نیان[3] Papinian بھی اس خدمت کو انجام دے چکا تھا، اور رومی ماہرین قانون میں سے آخری "جو اس کے مجاز ہیں کہ قانون بنائیں quibus permissum est jura condere اور جن کے متعلق یہ خیال کرنا درست ہے کہ ان کی رائے قانون کا اچھا ماخذ ہے — مودیستینوس Modestinus تھا، [زمانہ ۲۲۶ تا ۲۴۴ء] جو اسلام سے چار صدی پہلے گزرا ہے[4]، واضح رہے کہ کوئی قوم بعض وقت کسی دوسری قوم کے تمدن سے وہ چیزیں مستعار لیتی ہے جو اس کے زمانے میں اس کے ہاں پائی جاتی ہوں، لیکن

---

[1] دیکھو جسٹی نین کا مدونہ قوانین ۱/۱۴/۱۲ (Code, xiv, 12) (مؤلف)

[2] یہ رومی شہنشاہ ہے، جو ۳۰۵ء میں فوت ہوا۔ (مترجم)

[3] یہ ایک رومی قانون داں ہے، جسے شہنشاہ کاراکلا Caracalla نے ۲۱۲ء میں سزائے موت دی تھی (مترجم)

[4] جس آخری قانون والے کا ذکر ملتا ہے وہ ہرموگے نیانوس Hermogenianus ہے جو محض ایک معلومات کو جمع کرنے والا مؤلف Compiler ہے [جس میں کوئی اپج نہ تھی] اور یہ بھی اسلام سے تین صدی پہلے گزرا ہے۔ (مولف)

تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم نے کسی دوسری قوم کی طویل و قدیم تاریخ قانون میں آہستہ آہستہ ارتقاء کی جو تدبیریں ہوئی تھیں ان کو مستعار لیا ہو، اسلام کی ابتدائی دو صدیوں میں ایسے (غیر مسلم) علمائے قانون Prudentes پائے جاتے تھے جن کی مسلمان فقیہ نقل کر سکتے تھے، اور شاید انھوں نے نقل کی بھی[1]، لیکن یہ رومی نہیں بلکہ بابلی یہودی تھے، جو سورا اور پمبادیتا[2] میں رہتے تھے، اور کتاب تلمود[3] کی تعلیم گاہوں کے صدر (گونیم Gaonim) تھے، ہم اوپر [ص ۲۳] اس ممکنہ مماثلت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں، رومی علمائے قانون Prudentes اگر شہنشاہ کی مرضی کے تابع ہوا کرتے تھے تو اس کی مثال ربّی [یہودی] اہل قانون کے ہاں بھی ملتی ہے، ان میں سے ایک اپنے زردشتی مربی اور شہنشاہ ایران کے نام سے منسوب ہو کر عام طور پر شاپور کے

[1] یہودی عبرانی میں لکھتے تھے، اور اسے غیر یہودیوں سے مخفی رکھتے تھے، ان کی کسی چیز کا عربی میں ترجمہ نہیں ہوا تھا، ان کی تعداد بھی مٹھی بھر تھی، جن سے مسلمان اہل علم کو کبھی سابقہ ہی نہیں پڑتا تھا، اس لیے وہ سارے اعتراضات جو رومی اثر کے مدعی پر کیے جا سکتے ہیں، اس پر بھی وارد ہوتے ہیں کہ یہ یہودی اثر مسلمانوں پر کب اور کس طرح پڑا، ہر بچہ پیدا ہوتے وقت روتا ہے، یہودی بھی مسلمان بھی اور کوئی کسی دوسرے سے نہیں سیکھتا جب کوئی طریقۂ عمل معلوم نہ ہو تو ہر انسان پہلے اپنے ہاں کے قانون ہی کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر خود سوچتا ہے، سورا اور پمبادیتا میں نہ مسلمان رہتے تھے اور نہ وہاں سے کوئی مسلمان فقیہ پیدا ہوا، مسلمان فقہاء میں کسی نو مسلم یہودی کا بھی پتہ نہیں چلتا (مترجم) [2] دیکھو اوپر حاشیہ ۱۸/ب

[3] "تلمود" کا عبرانی لفظ وہی ہے جو عربی میں تلمذ اور تلمید (یعنی شاگردی اور شاگرد) کی شکل میں ملتا ہے، یہ توریت کی گویا شرح، اور ربیوں کی آراء پر مشتمل ہے، اس نام کی دو کتابیں ہیں، ایک بابلی تلمود اور دوسری یروشلمی تلمود۔ (مترجم)

کے نام سے معروف ہے، "اہل رائے" (یعنی رائے کی مدد سے قانون استنباط کرنے والے) کی اصطلاح سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اولاً امام ابوحنیفہؒ کے متبعین کے متعلق انکے مخالفین نے بطور اعتراض و طنز کے استعمال کیا، اس سے [ضمناً] یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ساری دنیا کے دیگر اہل قانون کی طرح مسلمان فقہاء بھی اس کو ماننے سے ہچکچاتے تھے، کہ وہ اپنی شخصی رائے سے قانون سازی کرتے ہیں — چاہے وہ حقیقت میں ایسا کرتے ہوں، اس کی مماثل شہادت اس روایت میں ملتی ہے، جس کے مطابق امام مالک نے کہا تھا کہ اگر کبھی وہ قیاس سے کام لیں تو انھیں کوڑے لگائے جائیں، ایک اور قدیم فقیہ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ "قیاس سور کے گوشت کی طرح ہے: اس کا کھانا صرف اس وقت جائز ہے، جب کوئی اور چیز موجود نہ ہو۔[1]

[1] "القیاس کالخنزیر لایؤکل الا عند الضرورۃ" یہ قول بعض انتہائی متشدد تابعین کی طرف منسوب ہے، بات تو صحیح ہے لیکن اسے برے اور گندہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اس کے مفہوم سے کسی کو اختلاف نہیں، اور خود "اصحاب الرائے" اور قیاس کا بلا استعمال کرنے والے بھی یہی کہتے ہیں، اس قول سے مراد یہ ہے کہ پہلے قرآن وحدیث پر عمل کیا جائے، اگر یہ دونوں ساکت ہوں تو اجماع پر اور سب کے آخر قیاس پر، اس کے سوا کوئی اور صورت درست نہیں، زیادہ شدید اس وقت پیش آئے گی جب اسکے بارہ میں قرآن وحدیث ساکت ہوں، جیسا کہ سلیم العوانے ازراہ عنایت مطلع کیا ہے کہ امام شافعی نے بھی اپنی کتاب "الرسالہ" میں اسکی مماثل عبارتیں لکھی ہیں، اس وقت ایسی صورتوں میں اجماع کے مطابق حکم دیگا، پھر قیاس جو اس [یعنی نص] سے ضعیف تر ہے، مگر وہ ضرورت کے موقع پر ہوتا ہے، نہ کہ جب "خبر" (یعنی حدیث) موجود ہو تو قیاس جائز نہیں ہوتا جس طرح تیمم کہ اس سے سفر میں طہارت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب پانی موجود نہ ہو، لیکن اگر پانی موجود ہو تو اس سے طہارت حاصل نہیں ہوتی" (الرسالہ ص ۱۸۱، شائع کردہ احمد شاکر) (مترجم)

(۵) "عربی [اسلامی] قانون میں مصلحت یا استصلاح کا جو اصول پایا جاتا ہے وہ
رومی قاعدہ "مفادِ عامہ" utilitas publica ہی ہے۔"

(۳۸) "مفادِ عامہ" کو رومی قانون کی ترقی کیلیے بطور اصول کبھی صراحت سے تسلیم نہیں کیا گیا۔ پہلی مرتبہ وہ قرونِ متوسطہ کے طلبہ میں اصولوں میں سے ایک کے نام کے طور پر دکھائی دیتا ہے[1]، یہ ایک بالکل مختلف قانونی اصول تھا، اس کے برخلاف یہ یہودی قانون کا ایک ممتاز اصول ہے، مثلاً کتاب مشنا گیتین Mishna Gittin ۴ اور ۵ (۴/۵) "عوام کی بھلائی کی پیش بندی میں" کا جملہ کم سے کم بارہ[12] مرتبہ دہرایا گیا ہے، اسلامی قانون میں اس اصول کی سب سے بڑی ترقی [امام مالک کے ہاتھوں] مدینہ منورہ میں ہوئی، مدینے میں یہودی اثر مسلمانوں کی دسترس میں تھا[2]، لیکن یہ مقام رومی اثرات سے بہت دور تھا،

(۳۹) اسی طرح اسلامی نظریہ "اجماع الائمہ" (یعنی ماہر اہلِ علم کا اتفاق رائے) گولٹ سیہر کی نظر میں عیسائی کلیسا سے مشابہ ہے[3]، اگرچہ یہ مماثلت قبول بھی کیجائے تو اس سے رومی قانون سے ماخوذ ہونا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ علماء کا اتفاق رائے کبھی بھی رومی قانون کا کوئی مستند و مسلمہ formal ماخذ نہیں رہا، شہنشاہ دقیانوس (دقلطیانوس) کے زمانے سے تو یقیناً ماخذ نہیں رہا، البتہ ربیون کے [یہودی] قانون کا ایک باقاعدہ ماخذ ہے، چنانچہ تلمود میں اکثر یہ جملہ دہرایا گیا ہے کہ "ہمارے سارے ربی یہ رائے رکھتے ہیں کہ ......"

[1] ممکن ہو کہ اندلس، صقلیہ اور مغرب اقصیٰ کے مسلمانوں ہی سے یہ تصور یورپ میں گیا ہو۔ (مترجم) [2] امام مالک کے زمانے میں مدینے میں کوئی یہودی نہ تھا، وہ عہد نبوی ہی میں وہاں سے جا چکے تھے۔ (مترجم) [3] اس سے مراد یہ ہے کہ کیتھلک کلیسا کے مطابق پادریوں کے اجماع پر روح القدس کا سایہ رہتا ہے اور ان کے فیصلے غلطی سے مبرا اور معصوم ہوتے ہیں۔ [illegible] "الجماعۃ" اور "لا تجتمع امتی علی ضلالۃ" کے مماثل ہے۔ (مترجم)

(۴۰) مذکورۂ بالا دلائل کی اساس پر گولٹ سیہر نے جو دعویٰ ثابت کرنا چاہا ہے، وہ یہ ظاہر یہ ہے کہ رومی قانون کے ایک سابقہ [قدیم تر] دور کی صورت حال سے اسلامی فقہا نے وہ ذہنی آلۂ کار مستعار لیا جس کی مدد سے انھوں نے اپنے نظام قانون کی تعمیر کی ہو، لیکن اس طرح مستعار لینے کی کوئی شہادت نہیں ملتی، اور حقیقت میں یہ سارا تصور ہی لغو ہے، اگر اس کی کوئی ضرورت پائی بھی جاتی رہی ہو یعنی [مسلمان فقہاء کا] ان کی ذاتی قابلیت لحاظ استدلالی قابلیت کے سوا کوئی اور ماخذ رہا بھی ہو تو دو ایسے ماخذ ہیں جو زیادہ قرین قیاس ہیں، ان دونوں کا اوپر ذکر ہوا، ان سے مسلمان کا سابقہ تھا، یعنی ربیون کے مدرسہ ہائے قانون، اور ان یونانی فلسفیوں کے جانشین جن کو جسٹینین نے ایتھنس سے جلاوطن کر دیا تھا، اور جنھوں نے ساسانی [ایرانی] سلطنت میں پناہ لی تھی، آخر الذکر [فلاسفہ] کے اثرات کی ایک مثال یہ ہے کہ اہم اصطلاح "فاسد" کی تعریف "جوہر" اور "عرض" کے واسطے سے کی جائے[1]، یہ ارسطو طالیسی منطق کی یاد دلاتا ہے، اگرچہ اس میں جو بنیادی تصور ہے، وہ خالص اسلامی چیز ہے، اسلامی قانون کا ایک اور ممکنہ ماخذ (جو ایک دوسری ہی چیز یعنی عبادات سے متعلق ہے،) اور جس کی طرف خود گولٹ سیہر نے اشارہ کیا ہے، وہ ساسانی سلطنت کا

[1] اگر یہاں اصل مضمون میں کوئی طباعتی غلطی نہیں ہوئی ہے تو اس گنجلک جملے کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کے "جوہر" میں برائی آئے تو وہ باطل اور حرام ہو جاتی ہے، اور اگر برائی "عرض" یعنی ذیلی چیز میں ہو تو وہ فاسد ہو جاتی ہے، اصل عبارت یہ ہے:

The definition of the emportant word fasid in terms of 'essence' and 'accident' is reminiscent of Aristotelian logic". (مترجم)

نظام قانون ہے، لیکن اس کے متعلق معلومات بہت کم پائی جاتی ہیں۔[1]

(۴۱) [رومی تاثیر کے متعلق] خود گولڈ سیہر نے اپنی ان دلیلوں کو جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تاثیر کے متعلق اس کا یہ گمان خود اسکے اس [منکرو کی] مضمون کے دوسرے اجزاء سے بمشکل مطابقت رکھتا ہے جس میں یہ نظریہ بیان ہوا ہے، کیونکہ وہاں اور اس کی دوسری چوٹی کی تالیفوں میں یعنی "اسلامی مسائل" Muhammedan-anische studien (مطبوعہ ۱۸۸۹ء تا ۱۸۹۰ء) اور "اسلام پر لکچر" Vorlesungen uber den Islam (مطبوعہ ۱۹۱۰ء) میں اس نے جو نقطۂ نظر پوری صراحت سے بیان کیا ہے اور جو آغاز اسلام کے وجوہ کا پتہ چلانے کے سلسلے میں اسکی نہایت قیمتی علمی خدمت رہی ہے، وہ یہی ہے کہ اسلام کے سارے نظام کی تعمیر میں عربوں کی قدامت پسندی نے جو حصہ لیا اس پر زور دیا جائے۔

(باقی)

---

[1] ایک ایرانی مولف علی مظاہری نے کچھ عرصہ ہوا پارس کے رسالے "افکار شیعہ" Pensee Chiite نمبر (۶) جنوری ۱۹۶۰ء میں ص (۱۰ تا ۲۰) پر فرانسیسی میں ایک چھوٹا سا مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے "ساسانی قانون کا اسلامی قانون سے مقابلہ" Le droit sassanide compare au droit musulman اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں ہی کی طرح مجوسی بھی یہ خیال کرتے تھے کہ قانون ایک خدائی امر ہوتا ہے؛ وہ الحاد، جادوگری اور ارتداد کو بھی حرام قرار دیتے تھے۔ پھر اس جملے کی آڑ لی ہے کہ "ساری مشابہتوں کے ذکر کیلیے ہمیں ایک پوری کتاب لکھنے کی ضرورت ہوگی"، جو سب سے بڑی مثال مشابہت کی انھیں ملی ہے وہ یہ ہے کہ ساسانی قانون میں "وزغ" کو (جس کے معنی پہلوی میں "مینڈک" کے ہیں) قتل کی اجازت ہے۔ اسلامی فقہ کی کتابوں میں بھی "وزغ" کے (جس کے معنے عربی میں "چھپکلی" کے ہیں) قتل کی اجازت ہے، البتہ فقہا نے مینڈک کے قتل سے صراحۃً منع کیا ہے، مگر اس عالمانہ بحث سے ساسانی قانون کی فقہ پر تاثیر کیا ہوئی، کچھ واضح نہیں ہوتا۔ (مترجم)

غالبؔ کا مذہبی رجحانؔ ان کے کلام کی روشنی میں

از ڈاکٹر ام ہانی ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی

مضمون نگار نے غالب کے مذہبی رجحان اور آیات قرآنی پر ان کی نظر کے ثبوت میں جو اشعار پیش کیے ہیں وہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں، آیات قرآنی سے متعلق اس قسم کی تلمیحات اس قدر عام ہیں کہ ان سے کم و بیش ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے اور ان سے کسی مسلمان شاعر کا کلام خالی نہیں نکل سکتا۔ ....

اس لیے یہ مضمون غالب سے زیادہ آیات قرآنی پر خود مضمون نگار کی نظر کا ثبوت ہے، اور اس حیثیت سے نئی چیز ہے کہ انھوں نے غالب کے کلام سے یہ اشارے ڈھونڈ نکالے اور ان سے متعلق آیات پیش کر دیں، ابتک کسی نے اس نقطۂ نظر سے کلام غالب کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس میں ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو غالب کو مذہب سے بالکل بیگانہ اور محض ایک آزاد مشرب رند لاابالی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ "م"

ہندوستان اور پاکستان میں شاید ہی کسی شاعر پر اتنی تحقیق و تنقید کی گئی ہو جتنی مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ پر کی گئی ہے خصوصاً گذشتہ صد سالہ برسی کے موقع پر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان موضوعات کا ایک سمندر امنڈ آیا ہے، لیکن پھر بھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ان کے کلام کا ایک پہلو اگر اچھوتا نہ رہ جاتا تو شاید ان کی زندگی کے اس گوشے کا بھی پتا چل جاتا جہاں ابتک محققین کی رسائی نہیں ہوئی۔ ان کے ذاتی حالات اور مذہبی رجحانات کے متعلق تمام نقاد اور محقق اس پر متفق ہیں کہ (توحید وجودی پر پختہ یقین رکھنے کے علاوہ) تمام عمر وہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں رہے بلکہ ان کے اعمال و اشغال و اقوال مذہب کے منافی تھے حتی کہ ان کے اس وصف نے خانگی تعلقات کو بھی درہم برہم کر دیا تھا، چنانچہ مختلف اصحاب قلم کی رائے ملاحظہ ہو:۔

مولانا حالی جن کو ذاتی طور سے غالب کی قربت حاصل رہی ہے، اور انکی تصنیف "یادگار غالب" مابعد کی تحقیق اور تنقید میں سنگ بنیاد کا درجہ رکھتی ہے، لکھتے ہیں:۔

"مرزا کی بیوی جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں، وہ نہایت متقی اور پرہیزگار اور نماز روزے کی پابند تھیں" (یادگار غالب، شانتی پریس الہ آباد ص ۹۲)

حالی نے ایک لطیفہ سے اس قول کی تائید بھی کر دی ہے،

"پنڈت موتی لال، میر منشی لفٹننی پنجاب مرزا سے ملنے آئے، کچھ پنشن کا ذکر چلا مرزا صاحب نے کہا "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار، پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے مجھے باغی مسلمانوں میں کیوں شمار کیا۔ (ایضاً ص ۷۲)

ان ہی بنیادوں پر مرزا کی مذہبی بے مبالاتی کا عقیدہ اتنا راسخ ہو گیا کہ بعد کے لوگوں نے اس کے خلاف کوئی جستجو کرتے ہوئے ان بنیادوں پر فلک شگاف عمارتیں تعمیر کر دیں۔

حمید احمد خاں لکھتے ہیں کہ انھیں جولائی ۱۹۳۸ء میں غالب کی ایک قریبی رشتہ دار بیوی بگا بیگم سے ملنے کا اتفاق ہوا جنھوں نے غالب کی خانگی زندگی کو آنکھوں سے دیکھا تھا جب

حمید صاحب نے غالب کے مذہب کے متعلق ان سے دریافت کرنا چاہا تو انھوں نے کہا: "ان کے مذہب کا کیا ٹھکانا، جہاں بیٹھے اس طرف ہو گئے"۔ (مقالہ غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک" آئینۂ غالب، گورنمنٹ آف انڈیا پریس ۱۹۶۴ء ص ۹)

عرشی صاحب نے بنظر احتیاط خود غالب کے الفاظ نقل کر دیے ہیں: "اگرچہ فاسق و فاجر ہوں مگر واحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیاء کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں، (مکاتیب غالب دیباچہ، ص ۱۸)

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں "میر کو بچپن سے تصوف کے اثرات ملے، اقبال کو گھریلو ماحول میں درویشی اور گہری مذہبیت ملی، غالب کو بیفکری اور عیش امروز ملا" (مقالہ غالب کی عظمت (مجموعہ) اردو کے کلاسکی شعراء پر تنقیدی مضامین، مرتبہ حبیب خاں، انڈین بک ہاؤس، قاضی پاڑہ، علی گڑھ، ص ۱۸)

پروفیسر رشید احمد صدیقی تحریر فرماتے ہیں: "وہ جو کچھ سوچتے تھے، یا جس طرح سوچتے تھے، وہ اتنا ہندی یا اسلامی نہ تھا جتنا عجمی، عقیدے اور ذہن دونوں اعتبار سے وہ عقبیٰ کے اتنے قائل نہیں معلوم ہوتے تھے جتنے عجم کے، غالب اپنے قول و فعل کا جواز نہ صرف ڈھونڈتے تھے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے تھے، کہتے ہیں

خوی آدم دارم آدم زادہ ام آشکارا دم زعصیاں می زنم

(غالب کی شخصیت اور شاعری، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ص ۸)

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں "ایک اور دلچسپ مسئلہ مرزا غالب کا مذہب ہے، ان کی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ مذہب سے دلچسپی عوام سے زیادہ رہی، "مہر نیم روز" جس کے شروع میں ابتدائے آفرینش کے متعلق ہند و عقائد کا خلاصہ درج ہے اور بعض اشعار

(مثلاً تحفۂ دیر) سے ہندو مذہب کے عقائد کے متعلق مرزا کی جو غیر معمولی واقفیت ظاہر ہوتی ہے وہ شاید آج بہت کم مسلمانوں کو ہوگی، دبستان مذاہب اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتی تھی، اور پارسیوں کی مذہبی کتب مثلاً دساتیر سے ان کی ذاتی واقفیت تھی، ممکن ہے کہ مذاہب عالم سے مرزا کی یہ دلچسپی ہرمزکی تعلیم کا اثر ہو، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انھیں یہ دلچسپی ضرور تھی، اور اس مسئلے کے متعلق ان کے کئی نہایت پاکیزہ اشعار ہیں، جو رسمی قافیہ پیمائی سے زیادہ قلبی کاوش کا پتہ دیتے ہیں، اس کے بعد انھوں نے کئی اشعار نقل کیے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے:-

با من میاویز ای پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد (غالب نامہ ص ۱۳)

اکرام صاحب نے ان کو دبستان مذاہب اور دساتیر میں بھٹکتا چھوڑ دیا اور اس سے قطعاً صرف نظر کر گئے کہ مندرجہ بالا شعر میں قرآن کی بہت واضح تلمیح ہے

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری انتہائی مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں، "یہ سرِ راہ اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے ہیں، یہ سرمستی اور مدہوشی کم مایگی نہیں ہے، بلکہ خمخانۂ جاوید میں داخل ہو کر بے اندازہ پی گئے ہیں، یہ کیف سرمدی ہے، یہ عشق الٰہی کے نشے میں غش ہیں، کون ایسا ہے جو اس کیف سے سرشار ہو کر ہوشمند رہ سکتا ہے"، (محاسن کلام غالب مطبوعہ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ص ۵۷)۔ مگر بجنوری صاحب اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی زندگی اب تک جو ہمارے سامنے آئی ہے، وہ دنیاداری اور عیش امروز کا ایک طویل سلسلہ ہے، ان کی شراب خوری خواہ "نشاط" کی غرض سے ہو یا "بیخودی" کی ضرورت سے مگر ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی، اس کے ساتھ ساتھ قماربازی

اور بازاری عورتوں پر گرویدگی، یہ دلچسپیاں مذہب کے منافی ہیں لیکن جب ہم ان کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو معتد بہ اشعار ایسے ملتے ہیں جو ہم کو یہ سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کے کردار کے سلسلے کی کچھ کڑیاں امتداد زمانہ میں کھو گئی ہیں اور جو کچھ معلوم ہوا اس میں مبالغہ زیادہ اور اصلیت کم ہے۔ اب رہ گیا خود ان کا بیان جو علماء نے ان کے کردار کے متعلق بطور سند پیش کیا ہے، وہ مختلف وجوہ کی بنا پر مستند قرار نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ (۱) غیر مسلم حکومت کا زمانہ تھا، ان کو اپنا مفر مسلمان نہ بننے ہی میں نظر آیا، جیسا کہ بندہات موتی سے ان کی گفتگو ظاہر کرتی ہے، (۲) اقرار گناہ مذہبی حیثیت سے بھی مستحسن سمجھا جاتا ہے، چنانچہ قرآن نے بھی مغفرت اور کشایش کے لیے اقرار گناہ کی تعلیم دی ہے، اور پیغمبروں کا اس پر عمل رہا ہے، مسلمانوں کے عام عقیدے کے مطابق مقبول ترین دعا آیۃ الکرسی کے نام سے مشہور ہے، اس میں حضرت یونسؑ نے لغزش کا اعتراف کیا ہے،

لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ

اور یہ دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوئی تھی، خدا کے اسی قانون کو مد نظر رکھتے ہوئے حافظ نے کہا ہے:

تو در طریق ادب کوش و گو گناہ منست

(۳) صوفیہ کے یہاں شطحیات اور طامات کی گنجایش بھی رکھی گئی ہے جس کے وسے شاعر کو اظہار خیال کی مخصوص آزادی حاصل ہوتی ہے، (۴) شعراء کی قدیم رسم چلی آئی ہے کہ وہ انفرادی حیثیت اختیار کرنے اور ناصح، واعظ اور امام شہر کی ضد میں مذہب کی زیادہ سے زیادہ مخالفت ظاہر کرتے ہوئے اپنی ذات کو انتہائی گنہ گار کی شکل میں پیش کرتے ہیں،

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو ان نے تو قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

تو کیا اس کو لفظ بلفظ صحیح مانا جا سکتا ہے؟

اور کبھی صاف صاف اعلان کر دیتے ہیں کہ ہماری گناہگاری صرف زاہد کی ضد میں ہے

ہمیں تو حضرتِ زاہد کی ضد نے پلوائی | یہاں ارادۂ شربِ مدام کس کا تھا

اقرارِ گناہ کے مضامین فارسی شعراء کے یہاں بھی بہت ملتے ہیں،

خیام۔ من بندۂ عاصیم، رضائے تو کجاست | تاریک دلم، نور و صفائے تو کجاست
مارا تو بہشت اگر بطاعت بخشی | آں بیع بود، لطف و عطائے تو کجاست

حافظ شیرازی جن کا شمار صوفیائے کرام میں ہوتا ہے، اور ان کو علیہ الرحمہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اور خود انھوں نے جا بجا اپنی قرآن دانی نیز عبادت اور ریاضت پر فخر کیا ہے، کہتے ہیں:

حافظا در کنجِ فقر و خلوتِ شبہائے تار | تا بود وردت دعا و درسِ قرآں غم مخور

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ | ہر چہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم

لیکن پھر بھی وہ کہتے ہیں:

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ | کہ گرچہ غرقِ گناہ است میرود بہ بہشت

غالب انکساری میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئے، انھوں نے کبھی اپنی قرآن دانی کا اظہار نہیں کیا، لیکن کلام کو جا بجا اس طرح قرآنی مضامین سے مزین کیا ہے جس طرح انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا جاتا ہے، اس کے باوجود رشید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"غالب طبعاً عجمی تھے، مسلمان، موحد اور صوفی بعد میں، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے حمد و نعت و منقبت میں عقیدت کے ہدیے پیش کیے ہیں، لیکن انکی شخصیت کا پہلو جتنا اتقیاد و طاعت کا ہے اتنا فکر و تخیل کی بلندی و برنائی اور عرفان و یقین کا نہیں ہے، وہ شاعر اور شخص دونوں اعتبار سے عجمی ہیں، عجم کے یزدان و اہرمن، لہراسپ

جاماسپ، جامِ جمشید، آتشکدوں اور لالہ زاروں اور ان سب کے رسم و روایات کے دے اس کا سراغ ان کے اردو کلام یا خطوط میں اس قدر نہیں ملتا جتنا فارسی کلام میں ملتا ہے۔" (غالب کی شخصیت اور شاعری ص ۱۸)

لیکن اگر موازنہ کیا جائے تو غالب کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے کلام میں خدا، محمد، جنت، دوزخ، حور، رضوان، یوسف، آدم، ابراہیم، ادریس، سلیمان، عیسیٰ، موسیٰ، ایوب، یعقوب، اوامر و نواہی اور آیاتِ قرآنی کے اقتباسات عجمی حوالوں سے کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں، ساتھ ہی یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ غالب کے یہاں محض یہی نہیں کہ یہ حوالے دوسرے فارسی اور اردو شاعروں سے زیادہ ملتے ہیں، بلکہ غالب کی تلمیحات قرآنی دوسرے شاعروں کی بہ نسبت متن قرآنی سے زیادہ قریب ہیں، اور یہ کمال معمولی محنت سے نہیں حاصل ہو سکتا، یہ کاوش انھوں نے کس زمانے میں کی، اس کا سراغ لگانا اب مشکل ہے، کیونکہ ان کی وفات کو سو سال سے زیادہ گزر چکے ہیں، معاصرین میں کوئی موجود نہیں، قریب العہد سوانح نگاروں نے اس طرف توجہ نہیں کی اور یہ بہت افسوس اور تعجب کی بات ہے، اس لیے کہ کلام غالب کی یہ غیر معمولی خصوصیت جو شاید کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غالب کا یہ کمال اپنے مذہب میں غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے کہ ان کو عربی زیادہ نہیں آتی تھی، مولانا حالی لکھتے ہیں:-

"مرزا نے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ استاد سے نہیں پڑھا۔" (یادگار غالب ص ۵۵)

مگر جو اصحابِ قلم کسی قدر غالب کے "طرفدار" ہوئے بھی تو انھوں نے "سخن فہمی" کا حق ادا نہیں کیا، یوسف حسین صاحب نے اس سلسلے میں صرف اسی قدر کہا ہے کہ

"انھوں نے اپنے عصیاں پر پردہ ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی ریاکاری کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو ایسا ظاہر کیا جیسے وہ حقیقت میں نہیں تھے۔" (غالب اور آہنگ غالب، غالب اکیڈمی، نئی دہلی)

مگر جن خوبیوں کے وہ حامل تھے، اور کلام میں جو قرآنی رنگ آمیزی کر کے مذہبی عقیدت کا جو ثبوت دیا ہے، اس کا کوئی ذکر نہیں، ایک آدھ فقرہ رشید صاحب نے ان کی نکوکاری کے سلسلے میں ضرور کہہ دیا ہے، مگر وہ کافی سے بہت کم ہے:-

"خطوط غالب کے مطالعے کے بعد اور اس کے صلے میں غالب کو عرش معلی کے جوار میں کوئی محل ضرور الاٹ ہو گیا ہوگا۔" (غالب اور انکی شخصیت ص ۲۵)

لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس واجبی عربی قابلیت کے ساتھ غالب نے متن قرآنی کو سمجھنے میں جتنی محنت کی تھی، اس کو فرشتوں نے "حسنات" میں لکھ کر تخلیق کلام ہی کے صلے میں غالب کو فردوس بریں کا کوئی محل الاٹ کرا دیا ہوگا، اس لیے کہ تلمیحات قرآنی کا استعمال فارسی اور اردو شعراء میں جتنا عام ہے، اتنا ہی ان کے لیے دشوار بھی ہے، عرفی نے نعتیہ قصیدے میں جس احتیاط کی تلقین کی ہے وہی یہاں بھی صادق آتی ہے،

ہشدار کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

چونکہ غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

اس لیے دوسروں نے بھی ان کی مدح میں ان کو فارسی شعراء کے ہم پلہ ٹھہرایا ہے، چنانچہ ان کے محبوب دوست حالی نے ان کے مرثیے میں کہا ہے:

عرفی و صائب و اسیر و کلیم   لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

لیکن جہاں تک شاعری میں قرآنی تلمیحات کا تعلق ہے، فارسی کے بڑے بڑے شعرا غالب کی کمیت وکیفیت کو نہیں پہنچتے، فارسی کے شاعروں نے اس ضمن میں بہت خطرناک حد تک غلطیاں کی ہیں، چنانچہ جمالی دہلوی ایک متبحر بزرگ ہونے کے باوجود ایک نعتیہ قصیدے میں کہتے ہیں:

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتو صفات   تو عین ذات می نگری در تبسمی

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے مقدمۂ سورۂ فاتحۃ الکتاب میں یہ شعر نقل کر دیا اور اس کی سند میں علمہ شدید القوی، ذو مرۃ فاستوی، وھو بالافق الاعلی ثم دنیٰ فتدلیٰ، فکان قاب قوسین او ادنیٰ کو پیش کیا ہے، (ترجمان القرآن، ساہتیہ اکاڈمی ص ۹۴-۹۵)

حالانکہ مندرجۂ بالا آیات حضرت جبرئیل سے متعلق ہیں، اور قرآن میں دوسری جگہ صاف صاف لکھا ہے

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار (۱۳- انعام ۶)

لہذا "عین ذات می نگری" کا دعوی پایۂ تصدیق کو نہیں پہنچتا، فارسی کے وہ شعرا جن پر ایران کو ناز ہے، اور اس سلسلے میں دوسرے بھی ایرانیوں کے ہم نوا ہیں، انکا حال سنیے:

فردوسی نے شاہ نامہ لکھا، مگر اس میں تلمیحات کی گنجایش نہیں تھی، اس کمی کو فوراً ایک مستقل تصنیف مثنوی یوسف زلیخا کے نام سے پورا کرنے کی کوشش کی (اگرچہ بعض ایرانیوں نے اس میں شبہہ ظاہر کیا ہے، کہ یہ فردوسی کی تصنیف ہے، لیکن اب وہ فردوسی کے نام سے چھپ چکی ہے،) شاعر نے آغاز ہی میں ظاہر کر دیا کہ اس کا ماخذ قرآن ہے:-

الف لام تلک آیات را بخواں تا بدانی حکایات را

لیکن فوراً ہی بعد "خوان آراستن یعقوب پنہاں از عصیا و آمدن بخدمت پدر و خبر کردن رفتن اسحاق بکار قربان بگمان اینکہ خوان از عصیا است و دعا کردن مستجاب شدن دعا در حق یعقوب" کے عنوان سے خارج از قرآن حکایتیں نظم کردیں،

اس تصنیف میں متعدد موضوعات اسی نوعیت کے ہیں، اور یہاں بے محل نہ ہوگا اگر جامی کا ذکر بھی کر دیا جائے، انھوں نے بھی یوسف زلیخا پر ایک منظوم تصنیف چھوڑی ہے، جو اپنے موضوع کے لحاظ سے مشہور ترین اور مقبول ترین مثنوی ہے، عبد اللہ یوسف علی اس سورہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:۔

In Persian the great Firdousi tried his hand at it. But the greatest masterpiece is that of Jami. I consider it one of the greatest master pieces of the world's literature.... The original persian is so grand and instructive that it is a pity that our Islamic students do not study it with the attention which it deserves."

(Appendix VI Translation and commentary Shaikh Mohd Ashraf, Kashmiri Bazar Lahore 1938 P 594)

اس کو صرف شاعری کا سحر ہی کہا جا سکتا ہے، کہ ایک بلند پایہ مترجم اور مفسر نے اس مثنوی کی اتنی تعریف کر دی، حالانکہ جامی نے بلند پایہ صوفی ہونے کے باوجود بھی اس مثنوی کو زلیخا کے خواب سے شروع کیا ہے جس کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں، (ان کا دارومدار مسیحی کتابوں پر ہے)

مولانا روم کی مثنوی پر "ہست قرآں در زبان پہلوی" کی چھاپ لگ چکی ہے لیکن ان ہی کے زمانے میں ان پر متن قرآنی سے انحراف کرنے پر اعتراض کیا گیا تھا تو انھوں نے جواب دیا کہ ہماری مراد اصل واقعے کی تبلیغ نہیں ہے، بلکہ ایک مثال قائم کر کے اپنے مقصود کے مطابق نتیجہ نکالنا ہے۔

ای برادر قصہ چوں پیمانہ الیست معنی اندروی بسانِ دانہ الیست
گفت نحوی زید عمراً قد ضرب گفت چونش کرد بی جرمی ادب
عمر را جرمش چہ بد کاں زید خام بگینہ او را بزد چوں غلام
گفت این پیمانۂ معنی بود گندمش بستاں کہ پیمانہ است رد
عمرو زید از بہر اعراب است ساز گر دروغ است آں تو با اعراب ساز

شیخ سعدی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف گلستاں میں تلمیحات قرآنی کا شاذ و نادر ہی استعمال کیا ہے، مثلاً

پسر نوح با بداں بنشست خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزی چند پی نیکاں گرفت و مردم شد

اس میں صرف "خاندان نبوتش گم شد" کا جملہ متن قرآنی سے ہے، "تا بداں بنشست" اگرچہ "انہ عمل غیر صالح" (سراپا خطا) کی تفسیر ہو سکتی ہے، مگر متن قرآنی سے خارج ہے۔

اسی طرح "مردم شد" کا جملہ بھی ہے۔

دوسری جگہ حضرت یعقوبؑ کا ایک مکالمہ تحریر کرتے ہیں۔

یکی پرسید ازاں گم کردہ فرزند کہ اے روشن گہر، پیر خردمند

زمصرش بوی پیراہن شنیدی چرا در چاہ کنعانش ندیدی

متن قرآنی کے لحاظ سے اس واقعے میں تھوڑی سی اصلیت ہے کہ کنعانی کنوئیں میں حضرت یوسفؑ رہے، لیکن حضرت یعقوبؑ نے ان کو نہیں دیکھا، مگر مصر سے پیراہن کی خوشبو سونگھ لی، یہ کسی قدر اصلیت کے خلاف ہے، اور اس میں غالب سے بھی لغزش ہوئی ہے،

بوی پیراہن زمصر آرد صبا دیدۂ یعقوب زو باید جلا

قرآن کہتا ہے:

ولما فصلت العیر قال ابوھم انی لاجد ریح یوسف۔ (۹۴-یوسف ۱۲)

(یعنی جب اونٹوں کا قافلہ مصر سے روانہ ہو گیا)

اسی طرح بوستاں میں حضرت عیسیٰؑ، ابراہیمؑ اور یوسف علیہم السلام کے متعلق جو حکایتیں ہیں، از روئے مقاصد نہایت خوب ہیں، خصوصاً وہ جس میں حضرت ابراہیمؑ کو خدا کی طرف سے ہدایت ہوئی ہے،

نش دادہ صد سالہ روزی و جاں

ترا نفرت آمد از دیک زماں

یہ اس وقت ہندوستان میں قومی ایکتا کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے، لیکن متن قرآنی سے دور ہے۔

حافظ شیرازی کا دیوان جس کو "لسان غیب" کہا جاتا ہے، اور حافظ شیرازی قرآن دانی کی قسم کھاتے ہیں

ندیدیم خوشتر از شعر تو حافظ بقرآنی کہ اندر سینہ داری

اشعار کی تعداد دیکھتے ہوئے ان کا دیوان زیادہ تلمیحات قرآنی کا حامل نہیں، اور جو تلمیحات شامل بھی ہیں، ان کا طریقہ دیانتداری کے خلاف ہے، اور حافظ علیہ الرحمہ کے شایان شان نہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں:

در عیش نقد کوش کہ چوں آبخور نماند

آدم بہشت روضۂ دار السلام را

دونوں مصرعے اصلیت سے خارج ہیں، کہتے ہیں "چوں آبخور نماند" حالانکہ قرآن میں صاف ہے: وکلا منہا رغداً حیث شئتما۔ "آدم بہشت" یعنی آدم نے چھوڑ دیا، حالانکہ قرآن کہتا ہے: واخرجھما مما کانا فیہ۔ یوں تو چھوڑ دینے اور نکالے جانے کا عملی نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے، مگر جبر و قدر میں اس مسئلے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، "دار السلام" بھی شاید وہ قافیے کی ضرورت سے لائے ہیں، حالانکہ قرآن میں کہیں اس کی صراحت نہیں ہے، قرآن میں صرف جنت کا لفظ ہے، یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ، اور دار السلام اس کا ایک طبقہ ہے۔

غالب: نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہاں بھی "خلد" کا لفظ کھٹکتا ہے، "اخرج" سے زیادہ قریب ہے بہ نسبت چھوڑنے (بہشت) کے۔

اسی طرح کہتے ہیں :

من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

قرآن کو سرتاسر دیکھ جائیے، اس میں کہیں لفظ عشق موجود نہیں ہے، اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ انتہائی محبت کا نام ہے تو زلیخا کا جو کیرکٹر قرآن نے پیش کیا ہے اس سے زلیخا کی محبت کا کہیں ثبوت نہیں ملتا، یہی شہرت ہے جس پر غالب نے طنز کیا ہے :

سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

جس کو واقعی محبت ہوتی ہے وہ نہ ناموس کی پروا کرتا ہے اور نہ رقیب کا وجود گوارا کرتا ہے

یا حافظ کا یہ شعر :

یوسفِ گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

یوسف گم گشتہ کی واپسی قرآن میں کہیں بھی مذکور نہیں، اور جب وہ واپس نہیں آئے تو ظاہر ہے کہ "کلبۂ احزاں" کیسے "گلستاں" ہو سکتا تھا، برعکس اس کے حضرت یوسفؑ کے اعزہ خود مصر گئے تھے۔ (باقی)

غالب

(مدح و قدح کی روشنی میں)

غالب پر ایک اہم زیر طبع کتاب مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

خریطۂ جواہر

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۴)

نورالدین ظہوری، عشق آں خانماں خرابِ ست کہ ترا آورد بخانۂ ما

عشق ایسا خانہ خراب ہے کہ تجھکو میرے گھر لاتا ہے، اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس کی خانہ خرابی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ایسے گھر میں لاتا ہے جو خود ویران ہے، یا اس کو بھی اپنی طرح ویران کرنا چاہتا ہے،

باکم سخنش می تواں ساخت این است بلا کہ کم نگاہ است

معشوق کی کم سخنی سے تو نباہ کیا جا سکتا ہے، مصیبت یہ ہے کہ وہ کم نگاہ بھی ہے، یعنی نگاہ ڈالنے کا بھی روادار نہیں،

بر جگرِ تشنگیِ خضر دلم می سوزد کہ سرچشمۂ تیغ دم آبے نہ چشید

خضر کی اس جگر تشنگی پر میرا دل کڑھتا ہے کہ تلوار کے سرچشمہ کا پانی نہیں چکھا، اور آب حیواں کے پھیر میں رہ گئے،

اس پر میر کا شعر یاد آگیا،

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

مرنج از من اگر در بزمِ وصلت کلفتے دارم — سرت گردم چہ پنہاں از تو اندک غیرتے دارم

اگر تیری بزم وصال میں مجھے کلفت ہوتی ہے تو اس سے رنجیدہ مت ہو، تیرے قربان تجھ سے کیا پردہ تھوڑی بہت غیرت مجھ میں موجود ہے، اس لیئے کلفت ہوتی ہے، یا تیری رقیب نوازی سے کلفت ہوتی ہے

ملا کمال ہمدانی: مارا ز خاکِ کویت پیراہن است بر تن — آں ہم ز اشکِ دیدہ صد چاک تا بدامن

ترے کوچہ کی خاک اتنی چھانی ہے اور وہ جسم پر اتنی پڑی ہے کہ لباس بن گئی ہے، اس کا بھی یہ حال ہے کہ آنسوؤں کی کثرت سے دامن تک سیکڑوں جگہ سے چاک ہے، کیونکہ اشک ریزی سے جسم کی خاک جگہ جگہ سے بہ جاتی ہے،

عبدالرحمٰن آغا جامی: بہ تو چوں رسد مریضے کہ ز فرطِ ضعف جانش — ز دلِ فگار تا لب بہ ہزار جا نشستہ

وہ مریض تجھ تک کس طرح پہنچ سکتا ہے جس کی جان کو ضعف کی شدت سے دل سے لب تک پہنچنے میں ہزاروں جگہ دم لینے کے لئے بیٹھنا پڑتا ہے،

ز ہلاک نیست باکم غمِ آں کند ہلاکم — کہ بمیرم و بکامِ دگراں گذارم اورا

مجھکو موت کا خوف نہیں ہے، مگر یہ غم مجھے مارے ڈالتا ہے، کہ میں مرجاؤں اور محبوب کو دوسروں کے لئے چھوڑ جاؤں،

من بحسرت دور گردد مدعی مغرورِ وصل — اے محبت خاک بر سر باد تاثیر ترا

اے محبت تیری تاثیر کے سر پہ خاک کہ میں تو حسرت کا مارا دور دور رہوں اور رقیب وصل پر مغرور اور اس سے شاد کام ہو،

عرفی شیرازی: خاطرم از پرسشِ روزِ جزا ہم جمع نیست — بسکہ می بینند مردم در میاں روے ترا

روز جزا کی پرسش سے بھی میرا دل مطمئن نہیں ہے، کیونکہ وہاں لوگ تیرا چہرہ دیکھیں گے، اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تجھ پر لوگوں کی نگاہوں کا پڑنا میرے لئے تکلیف کا باعث ہے، دوسرے

یہ کہ تیرا چہرہ دیکھ کر کس میں تیرے خلاف شہادت دینے کی ہمت ہوگی، اسلئے روز جزا بھی انصاف کی امید نہیں،

بلوحِ تربتِ پروانہ ایں رقم دیدم — کہ آتشے کہ مرا سوخت خویش را ہم سوخت

میں نے پروانہ کی تربت پر یہ تحریر دیکھی کہ جس آگ نے مجھکو جلایا اس کا انجام یہ ہوا کہ اپنے کو بھی جلا لیا، کیونکہ شمع بھی جل کر ختم ہو جاتی ہے،

ہرگز مگو کہ کعبہ ز بتخانہ خوشتر است — ہر جا بود کہ جلوۂ جانانہ خوشتر است

یہ ہرگز مت کہو کہ کعبہ بتخانہ سے بہتر ہے، جہاں بھی محبوب کا جلوہ ہو وہ جگہ بہتر ہے،

از خاکِ کشتگانِ تو ہر گل کہ می دہد — معلوم می شود کہ دل پارۂ کسے است

ترے کشتوں کی خاک سے جو پھول بھی کھلتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے دل کا ٹکڑا ہے،

خونابۂ حسرت چکدم از مژہ ہرگاہ — بینم کہ خداوند کسے بندہ نواز است

جب میں دیکھتا ہوں کہ کسی کا آقا بندہ نواز ہے، تو میری آنکھوں سے حسرت کا خونابہ ٹپکتا ہے کہ کاش میرا آقا و محبوب بھی بندہ نواز ہوتا،

عرفی بحالِ نزع رسیدی و بہ شدی — شرمت نیامد از دلِ امیدوارِ دوست

عرفی تو نزع کے حال میں پہنچکر بھی اچھا ہو گیا، تجھے محبوب کے امیدوار دل سے شرم نہ آئی جو تیری موت کی امید لگائے ہوئے تھا،

رفت آں آفتِ دیں از برم اے ہوش بیا — تا بہ بینم کہ چہ بر سرِ ایماں رفتہ است

ہوش سے کہتا ہے کہ وہ آفت دین یعنی محبوب میرے پہلو سے چلا گیا، اب تو واپس آ جا کہ یہ معلوم ہو کہ ایمان پر کیا گذری وہ سلامت رہا یا وہ بھی رخصت ہو گیا،

لب بدنداں دست در زیرِ زنخ دارد مسیح — گفتہ اے ہم نشیں گویا کہ ایں بیمار کیست

محبوب جو بیمار عشق کا مسیح ہے، اس طرح لبوں کو دانتوں سے دبائے اور ٹھوڑی کو ہاتھوں پر ٹیکے بیٹھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کا بیمار ہے، یعنی اپنے بیمار کی حالت دیکھکر خود اس کی حالت بیماروں جیسی ہو گئی ہے،

گرفتم اینکہ بہشتم دہند بے طاعت — قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف است

میں نے مانا کہ بغیر اطاعت و بندگی کے بھی مجھکو بہشت دیں گے لیکن جو بہشت بغیر طاعت کے ملے اسکو قبول کرنا اور اس میں جانا قرین انصاف نہیں ہے،

یک سجدۂ مستانہ و صد سال بطاعت — فہمیدن این مسئلہ موقوف دو جام است

اس مسئلہ کو سمجھنا کہ ایک سجدۂ مستانہ سو سال کی عبادت کے برابر ہے، دو جام شراب پر موقوف ہے، یعنی بے وحدت کی مستی ہی سے اسکو سمجھا جا سکتا ہے،

عشق می گویم و میگریم زار — طفل نادانم و اول سبق است

اس نادان بچہ کی طرح جو پہلی مرتبہ سبق پڑھنے پر روتا ہے میں عشق کے پہلے سبق پر عشق کا نام لیکر زار زار روتا ہوں،

گمان مبر کہ تو چوں بگذری جہان بگذشت — ہزار شمع بکشتند انجمن باقیست

یہ گمان نہ کرو کہ تمہارے ختم ہونے سے ساری دنیا ختم ہو جائیگی ہزاروں شمعیں گل کی جا چکی ہیں مگر محفل اسی طرح قائم ہے، کسی کے مرنے پر بزم عالم کی رونق ختم نہیں ہو سکتی،

شرمسار ہمت عشقم کہ در ہنگام نزع — اضطراب جان سپردن مانع دیدار نیست

میں عشق کی اس ہمت پر شرمسار ہوں کہ نزع کے وقت جان نکلنے کی بے چینی بھی دیدار میں مانع نہیں ہے، اس حالت میں بھی اس میں طاقت دیدار باقی ہے،

میروی با غیر و میگوئی بیا عرفی تو ہم — لطف فرمودی برو کیں پائے رفتار نیست

محبوب رقیب کے ساتھ جا رہا ہے اور کہتا ہے کہ عرفی تو بھی ساتھ چل، بڑی مہربانی، مگر مجھے معاف کرو اس حالت میں میرے پاؤں میں چلنے کی طاقت نہیں ہے،

لادم در گوشۂ تنہا و دریزم خون خود عرفی — مبادا قدر مردن ناشناسی دست من گیرد

عرفی میں اسلئے گوشۂ تنہائی میں بیٹھا کر اپنا خون گراتا ہوں کہ جو لوگ مرنے کی قدر نہیں جانتے میرا ہاتھ پکڑ لیں اور مرنے نہ دیں،

دیتِ قتل من اینست کہ در روز جزا — بزنم دست بدامانش و دامن بکشد

روز جزا میرے قتل کا خوں بہا یہ ہے کہ میں اس کا دامن تھامنا چاہوں اور وہ دامن کھینچ لے، یہ ادا خوں بہا کے لئے کافی ہے،

بلحد چگونہ زیں غم دلم آرمیدہ باشد — کہ بے جاں بمرگم چو تو نی گزیدہ باشد

قبر میں اس غم سے مجھے کس طرح سکون مل سکتا ہے کہ میری موت پر پشیمانی سے تو لبوں کو چبا رہا ہے، تیری یہ ندامت و پشیمانی بھی میرے لئے باعث اذیت ہے،

چشمم ز بہر خویش دم نزع تر شود — ترسم کہ من بمیرم و غم در بدر شود

نزع کے وقت اس خوف سے اپنے لئے روتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد غم کا ٹھکانا نہیں رہے گا، وہ مارا مارا پھرے گا،

اس سے ملتا جلتا ہوا غالب کا یہ شعر ہے،

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب — کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

نہ ز مہر آمدہ بر سر بالین دم نزع — حیف آید کہ گذاری بدلم حسرت خویش

تو نزع کے وقت میرے سرھانے از راہ لطف نہیں بلکہ اس لئے آیا ہے کہ میرے دل میں اپنی حسرت باقی نہ رہنے دے اپنا دیدار دکھا کر اس سے بھی محروم کرنا چاہتا ہے

دہن خویش ببوسند و لب خویش مکند
چوں در آئینہ بینند بتاں صورت خویش

یعنی جب خوبرو آئینہ دیکھتے ہیں تو اپنی صورت پر فریفتہ ہو کر خود اپنا منہ چومنے اور اپنا لب چوسنے لگتے ہیں،

بیا اے عشق رسوائے جہانم کن کہ یک چندے
نصیحتہائے بیدرداں شنیدن آرزو دارم

مجھ کو بیدردوں کی نصیحت سننے کی آرزو ہے، اس لئے اے عشق اگر مجھے ساری دنیا میں رسوا کر دے کہ ناصحوں کو نصیحت کا موقع ملے،

بہ تہمت گنہے می کشند بر دارم
کہ از نہ کردن آں قتل را سزا دارم

مجھ کو ایسے گناہ کے الزام میں دار پر چڑھا رہے ہیں کہ اس کے نہ کرنے پر سزا کا مستحق ہوں، یعنی اس جرم پر سزا دی جا رہی ہے کہ میں نے وہ گناہ کیوں نہیں کیا،

خوش آں ساعت کہ میرفتی و طاقت می رسید از من
تغافل از تو می بارید و حسرت می چکید از من

وہ وقت بھی کیسا خوش آیند تھا یا ہوگا کہ تم رخصت ہو رہے ہو اور میری طاقت جواب دے رہی ہو، تمہاری طرف سے تغافل برس رہا ہو اور مجھ سے حسرت ٹپک رہی ہو،

تو و بزم عیش عرفی من و کوچۂ کہ ہر سو
سر خوں چکاں فتادہ دل بینوا نشستہ

عرفی بزم عیش تیرا حصہ ہے، یا تجھکو مبارک ہو، میری قسمت میں تو وہ کوچہ ہے، جہاں ہر طرف خوں چکاں سر اور بینوا دل پڑے ہوئے ہیں،

قلی بیگ نجمی: دور از انصاف است برقِ آشیانِ من شدن
مشت خاشاکے بصد محنت فراہم کردہ است

میں نے بڑی مشقت سے ایک مٹھی تنکے فراہم کئے ہیں، اس لئے میرے آشیانہ کی برق بننا اور اسکو جلانا انصاف سے بعید ہے،

ہر کس کہ زیر تیغ بروئے تو نگاہ کرد
زاں پیشتر کہ کشتہ شود خونبہا گرفت

جس نے تیری تلوار کے نیچے آنے کے بعد تیرے چہرہ پر نگاہ ڈال لی اس کو قتل ہونے سے پہلے خونبہا مل گیا، تیرے چہرہ کو دیکھ لینا ہی قتل کا خوں بہا ہے،

قاضی مشہدی: بچہ اندیشہ ام از خاطر ناشاد روی
چہ بخاطر بگذارم کہ تو از یاد روی

تو کس اندیشہ سے میرے دل سے نکلا جاتا ہے، جب تیری یاد ہی نکل جائیگی تو پھر دل میں رہنے کے لئے کیا رہ جائے گا،

ملا علی: نشد کہ از سر ما فتنہ دست بردارد
بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست

مجھے فتنہ سے کبھی نجات نہیں ملی، جس سرزمین میں بھی میں گیا، فتنہ پردازی کیلئے آسمان پیدا ہو گیا،

نعمت خاں عالی: ز مردم یار می پرسد کہ عالی کیست طالع بیں
کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

میری یہ قسمت بھی دیکھنے کے لئے لائق ہے کہ میری ساری عمر تو محبت میں گذر گئی، اس کے باوجود محبوب مجھ کو نہیں پہچانتا اور لوگوں سے پوچھتا ہے کہ یہ عالی کون شخص ہے،

من و ایں مہربانیہائے او قاصد چہ میگوئی
مساز از پیش خود حرفے کہ میدانم زبان او

میں اور اس کی یہ مہربانیاں! قاصد تو کیا کہہ رہا ہے، اپنی طرف سے بات نہ بنا، میں اسکی زبان پہچانتا ہوں، یہ باتیں اس کی نہیں ہو سکتیں،

حسرت ایں است کہ صیاد مرا چندانی
در قفس داشت کہ راہ چمن از یادم رفت

افسوس اور حسرت اس کی ہے کہ صیاد نے مجھ کو اتنے دنوں تک قفس میں رکھا کہ چمن کا راستہ ہی بھول گیا، اب اگر آزاد بھی ہو جاؤں تو وہاں تک نہیں پہنچ سکتا،

تا کے آں بیوفا از وعدہ خاموشم کند
یا کند فکرے بحالم یا فراموشم کند

بے وفا محبوب مجھے کب تک وعدوں سے بہلاتا رہے گا، یا اس کو میرے حال کی فکر کرنی چاہئے یا بالکل بھلا دینا چاہئے، کہ اس گومگو سے نجات ملے،

دوش ازاں شوخِ جفا پیشہ خود نالیدم — دل کشید آہ کہ یار است چہ می باید کرد

کل جب میں نے اس جفا پیشہ کے ظلم پر نالہ کیا تو دل نے آہ کھینچکر کہا کہ دوست کا معاملہ ہے کیا کیا جائے، بہر حال اس کو برداشت کرنا ہے،

فتنہ در چشم نگار است چہ می باید کرد — گردش لیل و نہار است کہ من می دانم

اس نگار کی آنکھوں میں فتنہ کے آثار ہیں کیا کیا جائے، اس لیل و نہار کی گردش کو میں ہی جانتا ہوں

بے تو ہر گہ کہ تماشائے گلستاں کردم — ہمچو گل دامن خود پر ز گریباں کردم

میں نے جب بھی تیرے بغیر گلستاں کی سیر کی، تو جوشِ دیوانگی میں پھولوں کی طرح دامن کو گریبان کے ٹکڑوں سے بھر دیا یعنی تیری یاد میں گریبان کو تار تار کر دیا،

حیف این ست کہ جاں در غم ہجرانِ تو رفت — کاش در روزِ وصال تو فدا می کردم

افسوس اس کا ہے کہ تیرے ہجر میں جان گئی کاش وصل کے دن پر اسکو تجھ پر سے نثار کر دیے ہوتا

پیش صیادِ من بیدل از بہر خدا ضامن شوید — یک پر یدن تا سر دیوار می خواہد دلم

خدا کے واسطے بیدل جاکے سامنے میری ضمانت لے لو، صرف دیوار کے کنارے تک اڑنے کا دل چاہتا ہے، اس سے آگے نہ جاؤنگا،

من بیدل بفتوائے وفا کشتنیم — یار را از گلہ جور پشیماں کردم

میں تو اپنی وفا کے فتوی ہی سے قتل کے لائق ہوں، کیونکہ میں نے محبوب کو جور کا گلہ کرکے پشیمان کیا ہے، جس کی سزا قتل ہونا چاہئے،

چہ بیدل دانہ امشب درد دل از یار می گفتم — کہ او کم شنید از من و من بسیار می گفتم

میں نے اس بے دردی سے آج کی رات یار سے درد دل بیان کیا کہ وہ بہت کم سنتا تھا، اور میں پوری داستان بیان کر رہا تھا،

از پئے او روان شدم دست زدم بدامنش — کرد تبسمے بمن زد بقفا کہ این چنیں

میں اس کے پیچھے چل رہا تھا، اس کا دامن تھامنا چاہا تو وہ منہ پھیر کر مسکرادیا کہ لو اس طرح، اس این چنیں کی وضاحت مرزا غالب کے اس شعر سے ہوگی،

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی — ہنس کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

نہ آشنا و نہ بیگانہ، نمیدانم — کہ اختلاط چنیں را کسے چہ نام کند

تو نہ تو پورا آشنا ہے اور نہ بالکل بیگانہ، سمجھ میں نہیں آتا ایسے تعلق کو کس نام سے یاد کیا جائے،

دلا بحالت مرگم ترا بشارت باد — کہ بعد ازیں بود ایام آرمیدن تو

دل سے کہتا ہے کہ میری موت تیرے لئے خوشخبری ہے کہ اس کے بعد تیرے آرام و راحت کا زمانہ ہوگا، تجھے ساری کلفتوں سے نجات مل جائیگی،

میرم و بر زندگانم رحم می آید مرا — خو بہ آں بیدا دہا داری کہ با من کردہ

مرتے وقت مجھ کو زندہ لوگوں پر اس لئے رحم کرتا ہے کہ تجھکو تو ایسے مظالم کی عادت ہو گئی ہے جو تو نے مجھ پر کئے ہیں، میرے بعد ان کو یہ ظلم سہنا پڑیں گے،

نکند رحمت عام تو در آمرزش ما — آنقدر صبر کہ از کردہ پشیماں گردم

تری رحمت عام کی شان یہ ہے کہ اس کو عفو میں اتنا توقف بھی گوارا نہیں کہ مجھ کو اپنے اعمال پر پشیمان ہونے کی ضرورت پیش آئے، اس سے پہلے ہی تو معاف کر دیگا،

داری ہوس کہ غیر برائے تو جاں دہم — آہ ایں چہ آرزوست مگر مردہ ایم

معشوق سے کہتا ہے کہ تجھکو اس کی ہوس ہے کہ رقیب تیرے لئے جان دے، آہ یہ کیسی آرزو ہے، گویا میں مرگیا ہوں، یعنی میرے جیتے جی یہ تیری آرزو، آخر میری زندگی کس لئے ہے،

میر کا شعر ہے،

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف ۔ اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

ناصر علی: در فیض است منشیں از کشایش ناامید اینجا ۔ برنگ دانہ می روید ز ہر قفلے کلید اینجا

یہ فیض کا دربار ہے، اس لئے کشود کار سے ناامید نہ ہو، یہاں دانہ کی طرح ہر قفل کی کنجی اُگتی ہے، یعنی ہر کام بن جاتا ہے، اس لئے ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں،

رہائی دادہ بر پا رشتہ پیچیدہ صیادم ۔ کہ تا باشد وبال خون من بر گردن خویشم

مرے صیاد نے میرے پاؤں میں تاگہ باندھ کر اس لئے رہا کر دیا ہے تاکہ میرے خون کا وبال میری گردن پر رہے، صیاد پر اس کی ذمہ داری باقی نہ رہے، (چڑیا کے پاؤں باندھنے کے بعد اس کا جینا دشوار ہوتا ہے)

علی عظیم: از بیابان عدم تا سر بازار وجود ۔ بتلاشِ کفنے آمدہ عریانے چند

انسان عریاں پیدا ہوتا ہے اور مرنے کے بعد صرف کفن اس کے ساتھ جاتا ہے، اس سے فائدہ اٹھا کر کہتا ہے کہ عدم کے بیاباں سے چند عریاں بدن بازار وجود یعنی دنیا میں کفن کی تلاش میں آئے ہیں

میر عبد الحسین: پا در حریم محفل دلہا شمردہ اند ۔ آہستہ باش تا نہ زنی شیشہا بہم

دلوں کی محفل کے حرم میں قدم گنے جاتے ہیں، اسلئے آہستہ چلو کہ تیز روی سے دل کے شیشوں کو ٹکر اور یعنی تعلقات میں ایک دوسرے کا پاس و لحاظ ضروری ہے،

انیس کہتے ہیں،

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم ۔ انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

غزالی مشہدی: حسن شہرت عشق رسوائی تقاضا می کند ۔ جرم معشوق دگنا ہے عاشق بیچارہ چیست

حسن کا فطری تقاضا شہرت اور عشق کا رسوائی ہے اس میں نہ عاشق کا قصور ہے اور نہ معشوق کا،

شورے شدہ واز خواب عدم دیدہ کشودیم ۔ دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

دنیا میں آنے اور پھر یہاں سے واپس جانے کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ ازل میں شور وجود سنکر

آنکھ کھل گئی یعنی دنیا میں آگیا، یہاں دیکھا کہ شب فتنہ باقی ہے، یعنی دنیا کے ہنگاموں کو دیکھکر پھر آنکھ بند ہو گئی،

چرخ فانوس خیال و عالمے حیران درو ۔ مردماں چوں صورت پروانہ سرگرداں درو

عالم ایک خیالی فانوس ہے، جس میں ساری دنیا حیران ہے، اور انسان اس فانوس کے گرد پروانوں کی طرح سرگرداں ہے، یعنی دنیا ایک خیالی حیرت خانہ ہے اور ایک عالم اس کے پیچھے سرگرداں ہے،

اسی سے ملتا جلتا غالب کا یہ شعر ہے،

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ ۔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

میر کاکانی: می شوم گستاخ ہر گہ مہربانی می کند ۔ او بہ من کم لطفی از بسیار دانی می کند

محبوب اس سے واقف ہے کہ جب وہ لطف و مہربانی سے پیش آتا ہے تو میں گستاخ و بے تکلف ہو جاتا ہوں اس بسیار دانی کی وجہ سے وہ نگاہ لطف کم کرتا ہے اس میں صنعت کم و بسیار کی تجنیس ہے

غضنفری: یارانہ با رقیب بسے گفتگو کنم ۔ تا در میان تفحص احوال او کنم

میں رقیب سے اس لئے دوستانہ زیادہ باتیں کرتا ہوں تاکہ اس سے محبوب کے حالات کا کچھ پتہ چلے،

تا بفراق خو کنم صبر کجا قرار کو ۔ وعدۂ وصل گر دہد طاقت انتظار کو

اتنا صبر و قرار کہاں کہ اپنے کو فراق کا عادی بنالوں اگر محبوب وصال کا بھی وعدہ کرے تو انتظار کی طاقت کس میں ہے،

بر علی الحق غنی: بر شیشۂ دلم مفگن سنگ امتحاں ۔ آں عضو نیست دل کہ تواں بست چوں شکست

میرے شیشۂ دل پر امتحان کا پتھر نہ مار، دل وہ عضو نہیں ہے جو ٹوٹنے کے بعد پھر جوڑا جا سکے،

اے کاش خاکِ رہگذرے دوست بودمے	تا رخ بکامِ دل بکفِ پاش سودمے

کاش میں محبوب کی راہ کی خاک بنجاتا کہ دل کی آرزو بر آری کیلئے اس کے تلوؤں سے مَلتا، یعنی میری خاک اس کے قدموں میں لگتی، اس طرح دل کی آرزو پوری ہوتی،

یغرؔتی تبریزی؛ ستم رسیدہ دلے دیدم و زغم مردم	کہ تند خو و ستمگر دریں دیار یکیست

میں نے جب کسی ستم رسیدہ دل کو دیکھا تو یہ سمجھ کر اس کے غم میں مرگیا، کہ اس دیار میں صرف ایک ہی تند مزاج و ستمگر ہے (یعنی محبوب) ہے، یہ بھی اسی کا ستایا ہوا ہوگا،

عمرے گذشت و راہِ سلامے نیافتم	شرمندۂ دلم کہ چہا در خیال داشت

میں دل سے شرمندہ ہوں کہ اس کے کیا کیا خیالات تھے، لگر ایک عمر گذر گئی، اظہار مدعا کا کیا ذکر اس کو سلام کرنے کا موقع بھی نہیں ملا،

بہ جو بیخبر شوم از دیدن تو رشک برم	کہ درمیانِ تو و دل چہ راز می گذرد

جب تجھکو دیکھکر اپنے سے بیخبر ہو جاتا ہوں تو اس خیال سے بڑا رشک آتا ہے کہ میری بیخبری میں تیرے اور دل کے درمیان کیا کیا راز و نیاز ہوا ہوگا،

غیاث حلوائی؛ چو مرگم شد یقینت لطفہا کردی کہ می بخشند	مریضِ مردنی را ہر چہ در دل آرزو باشد

جب میری موت کا تجھکو یقین ہوگیا، اس وقت تو نے لطف و مہربانی کی نظر کی کیونکہ جو مریض مرنے والا ہوتا ہے اسکی جو آرزو ہوتی ہے پوری کی جاتی ہے،

بپائے شمعِ خود شاید کہ من ہم جاں پرافشانم	زبالِ خویش اے پروانہ دستے بر سرِ من کن

پروانہ سے کہتا ہے کہ اپنے پروں کا ہاتھ میرے سر پر رکھ دے، شاید اسی کی مدد سے تیری طرح میں بھی اپنی شمع کے قدموں پر جان دیدوں،

سرخوشی؛ بعد ازیں در عوضِ اشک دل آید بیروں	آب چوں کم شود از دجلہ گل آید بیروں

اشکباری کے بعد آنسوؤں کے بجائے دل باہر نکل آئیگا، کیونکہ جب دریا میں پانی کم ہوجاتا ہے تو سطح کی مٹی نکل آتی ہے،

غنی کشمیری؛ غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن	کہ روشن کرد نور دیدہ اش چشم زلیخا را

غنی پیر کنعاں (حضرت یعقوبؑ) کا یہ روز سیاہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ اس کے نور دیدہ (حضرت یوسفؑ) نے اپنے دیدار سے زلیخا کی آنکھوں کو روشن کیا، مشہور ہے کہ حضرت یوسفؑ کے غم میں حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی،

کس وقتِ نزع بر سرم از بیکسی نبود	شرمندہ ام ز عمر کہ آمد بسر مرا

میں اپنی اس بیکسی پر اپنی عمر سے شرمندہ ہوں کہ وہ ختم کے قریب آگئی، مگر نزع کے وقت بھی کوئی سرہانے کھڑا ہونے والا نہ تھا،

نمی کند بمن ناتواں نگہ آں شوخ	ز بیم آنکہ نہ گویند ناتواں بیں است

وہ شوخ اس خوف سے مجھ ناتواں کی طرف نہیں اٹھاتا کہ لوگ اسکو ناتواں بیں نہ کہیں، (ناتواں بینی عیب ہے)

کند در ہر قدم فریاد خلخال	کہ حسن گلرخاں پا در رکاب است

چھاگل پاؤں میں پہننے کا زیور ہے، اس کے گھنگرو چلنے میں بجتے ہیں، اس سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ چھاگل ہر قدم پر فریاد کرتا ہے کہ گل رخوں کا حسن پا در رکاب، یعنی عارضی اور زوال پذیر ہے، گھنگرو، قدم اور پا بر رکاب کی مناسبتیں ظاہر ہیں،

زاہد اگر ز کردۂ پشیماں نگشتہ است	در ہر نماز دست بزانو چہ می زند

شیعہ نماز کے قعدہ میں زانو کو ہاتھ سے تھپتھپاتے ہیں اور زانو پر ہاتھ مارنا پشیمانی کے موقع پر ہوتا ہے، اس سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اگر زاہد اپنے اعمال (عبادات) وغیرہ سے پشیمان

نہیں ہے، تو نماز میں زانو پر کیوں ہاتھ مارتا ہے،

بر داشت چو بلبل آشیاں را — گل گفت کہ "خس کم و جہاں پاک"

آشیاں خس یعنی تنکوں سے بنتا ہے "خس کم جہان پاک" اردو میں بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی ناگوار چیز سے چھٹکارا ملے اور وہ دور ہو جائے، اس سے فائدہ اٹھا کر کہتا ہے کہ بلبل نے جب چمن سے آشیانہ اٹھایا تو پھول نے کہا کہ "خس کم جہاں پاک" اس بلا سے نجات ملی،

جاں بلب از ضعف تو انم رسید — ما بزور ناتوانی زندہ ایم،

میری جان میں ضعف کی وجہ سے لب تک آنے کی بھی طاقت نہیں ہے اس لئے نہیں نکل پاتی، اس لئے میں گویا ناتوانی کی طاقت سے زندہ ہوں جو درحقیقت موت کا سبب ہوتی ہے،

حسن سبز بخط سبز مرا کردہ اسیر — دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

شکاری شکار کو دھوکا دینے کے لئے جال پر گھاس وغیرہ ڈال کر زمین کا ہمرنگ بنا دیتے ہیں صباحت و ملاحت کی طرح حسن کا ایک رنگ سبز بھی ہے، "خط سبز" سبزۂ آغاز ہونے کو کہتے ہیں اس سے یہ تخیل پیدا کیا ہے، کہ ایک سبزہ رخ حسین نے اپنے خط سبز سے مجھ کو اسیر کر لیا ہے، کہ جال زمین کا ہمرنگ تھا،

عزت شاہ و گدا زیر زمیں یکسانست — می کند خاک برائے ہمہ کس جا خالی

مرنے کے بعد سب زمین میں دفن ہوتے ہیں، اس میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، اس سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ زیر زمین شاہ و گدا سب کی عزت یکساں ہے، وہ ہر شخص کے لئے جگہ خالی کر دیتی ہے، کسی کے ساتھ امتیاز نہیں برتتی،

"درباقی"

باب التقریظ والانتقاد

ایران سوسائٹی سلور جوبلی سووینیر

(۱۹۴۴ء - ۱۹۶۹ء)

از

سید صباح الدین عبد الرحمن

یہ انگریزی کتاب ایران سوسائٹی، کلکتہ کی تازہ مطبوعات کیا، بلکہ فتوحات میں سے ہے، یہ ادارہ سنہ ۱۹۴۴ء سے کام کر رہا ہے، جس سے معارف کے ناظرین اچھی طرح واقف ہیں، یہ اپنے سہ ماہی انگریزی رسالہ انڈو ایرانیکا اور متعدد مطبوعات کے ذریعہ سے فارسی علوم و فنون کی مفید خدمات میں گزشتہ ۲۰ برس سے لگا ہوا ہے، اسی کے ساتھ اسلام کے مشاہیر کی یاد میں کئی یادگار جلدیں بھی شائع کر چکا ہے، جن میں بوعلی سینا اور البیرونی کی دو ضخیم جلدیں بہت مقبول ہوئی ہیں،

زیر نظر کتاب اس ادارہ کی سیمیں جوبلی کی یاد میں شائع کی گئی ہے، اس کی ضخامت ۴۰۲ صفحے ہے، کلکتہ میں جو عمدہ سے عمدہ چھپائی ہو سکتی تھی، اسی معیار کے لحاظ سے یہ طبع کی گئی ہے، کاغذ بھی بہت ہی اچھا لگایا گیا ہے، ان ظاہری خوبیوں کے ساتھ اندر معنوی خوبیاں بھی ہیں، اس میں ایشیا، یورپ اور امریکہ کے ۲۶ اہل قلم کے مضامین ہیں، جیسا کہ حسب ذیل فہرست سے اندازہ ہوگا، (۱) تمہید از ادارہ (۲) ایران سوسائٹی کی مختصر تاریخ از جناب خواجہ محمد یوسف صاحب کلکتہ (۳) فرخ بیگ مصور کی

بنائی ہوئی ابراہیم عادل شاہ کی شبیہ از پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ (۴) ایک یہودی ایرانی مناظر از پروفیسر ڈاکٹر جے۔ پی۔ اسموسین، کوپن ہیگن، (۵) ہندوستان میں ایرانی النسل ارمنی از ایچ۔ ایل (۶) تصوف کا سلسلۃ الذہب از پروفیسر فیروز، سی داور، احمد آباد (۷) مطبع کی گنج معانی از ڈاکٹر ضیاء الدین عبدالحئی دیسائی ناگپور (۸) بنگال میں ترک افغان عہد (۱۲۰۳–۱۵۳۸ء) میں عربی اور فارسی لٹریچر از ڈاکٹر جن مائی دت، کلکتہ (۹) نئی فارسی کے الفاظ میں دار اور تار کا استعمال از پروفیسر ڈاکٹر ولیم ایلرس، ورزبرگ، مغربی جرمنی (۱۰) محمد عارف شیدا از ڈاکٹر محمد عبدالحمید فاروقی احمد آباد (۱۱) خراسان میں عربی زبان از پروفیسر رچرڈ این فرائی ہرورڈ یونیورسٹی، (۱۲) ایک ہندوستانی شہزادہ اور فرانسیسی انقلاب از پروفیسر محب الحسن، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، (۱۳) رودکی نئی فارسی شاعری کا ابوالآباء از ڈاکٹر محمد اسحٰق (۱۴) جیمس موریہ اور اس کا ناول حاجی بابا اصفہانی از ڈاکٹر حسن جوادی تبریزی طہران (۱۵) ایک اعلیٰ مذہبی پروہت منوس چہر گوشن جن کے خیال میں از پروفیسر ام۔ اف۔ کانگا، پونا (۱۶) ختم شدہ پہلوی لٹریچر کی جھلکیاں از مسٹر جمشید کاؤس جی کٹراک، بمبئی، (۱۷) ۱۹۰۵–۱۹۱۱ء میں ایران کا دستوری انقلاب از ڈاکٹر ٹنکی۔ اے۔ کیڈی لاس انجلیز (۱۸) گیارہویں صدی کی ایک اسپینی عربی تصنیف میں قدیم ایران پر ایک باب از ڈاکٹر محمد صابر خان (۱۹) مصور نظرت محمد نقی بہار از پروفیسر فرانسس زیک مچال سکی (۲۰) رودکی کے مجموعہ کلام کا ایک جعلی نسخہ، از پروفیسر عبدالغنی مرزوئیو (۲۱) فارسی زبان کے ہندی الاصل شعراء از سید صباح الدین عبدالرحمن (۲۲) قدیم میسوپوٹیمیا کے میں ایرانی طرز کا ایک حیتیل کاہل از پروفیسر ادماس سیلونن (۲۳) قدیم ایران کا ایک ہجری کتبہ از ریورنڈ ایف فادر شارپ (۲۴) قطب شاہی سلطنت کے زوال کے وقت کچھ ثقافتی پہلو (۲۵) ملک الشعراء بہار: دانشور از پروفیسر رشاد سلام شاہجہان (۲۶) مسالۃ الصفات الذاکرین والمتفکرین، از استاذ ابو محفوظ الکریم معصومی،

اوپر کی فہرست سے ظاہر ہوگا کہ یہ مضامین بڑی محنت اور کاوش سے جمع کئے گئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ایک المیہ یہ ہے کہ یہ تمام مضامین ایرانی سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر محمد اسحٰق نے جمع کئے ان کو ایڈٹ کرکے مرتب بھی کیا، مگر یکایک وہ جنت کو سدھارے، اور اپنی محنت کو کتاب کی صورت میں دیکھ نہ سکے، ان کی وفات کے بعد اڈیٹروں کے ایک بورڈ نے اس کو مرتب کیا، جس کے اراکین ڈاکٹر اے۔ کے۔ بی۔ ق۔ مشہودی بولاڈین، جناب خواجہ محمد یوسف اور جناب عبدالمجید تھے، ان اراکین نے بڑی خوش سلیقگی سے اس کتاب کو علم کے شائقین کے ہاتھوں میں دیکر ڈاکٹر صاحب مرحوم کی روح کو خوش کیا ہے، اس کے ناظرین کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی روح بجا طور پر یہ کہہ سکتی ہے،

دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذت درد　　کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

اس مجموعہ میں مقالات کی ابتدا ڈاکٹر نذیر احمد کے مقالہ سے ہوئی، جو اپنی تحقیق کی گہرائی اور دیدہ وری کے لئے علم و فن کی صف میں اب تک بہت نمایاں ہو چکے ہیں، اس مضمون میں اس تصویر پر بحث ہے جس میں بیجاپور کا ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء) بیٹھا ساز بجا رہا ہے اس کے سامنے تین درباری بیٹھے اس کو داد دے رہے ہیں، پھولوں اور درختوں سے تصویر بہت ہی نظر افروز کر دی گئی ہے، حاشیہ میں گل کاری ہے، اور جا بجا پرندے چہک رہے ہیں، ابراہیم عادل شاہ کی تصویر بڑی جیتی جاگتی ہے، یہ تصویر اس زمانہ کے مشہور مصور فرخ بیگ کی بنائی ہوئی ہے، جو اکبر ابراہیم عادل شاہ ثانی اور جہانگیر کے دربار سے وابستہ رہا، اس تصویر سے متعلق زیکمو سلو وکیہ کے ایک اہل قلم لیوبر جاجک ایک اور یوروپین اہل نظر رابرٹ اسکلیٹن اور خود ڈاکٹر نذیر احمد کی رائے میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اسی پر پورے مضمون میں ایک فاضلانہ بحث ہے، اس سلسلہ میں فرخ بیگ اور محمد حسین زریں قلم پر مفید معلومات فراہم ہو گئی ہیں،

اس کتاب میں جتنے اور فاضلانہ مضامین ہیں ان میں سے راقم نے اپنے ذوق کے مطابق بعض

مضامین کو بڑی دلچسپی سے پڑھا، پہلے تو خود ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے مقالہ کی طرف نظر گئی، مولانا شبلی نے شعر العجم کی پہلی جلد میں رودکی پر بڑا اچھا باب لکھا ہے، اس میں وہ رقمطراز ہیں کہ رودکی ہومر کی طرح مادرزاد اندھا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہ بتایا ہے کہ اس نے کافی عمر پاکر اپنی بینائی کھوئی، ثبوت میں اس کے چند اشعار پیش کئے ہیں، جن سے اس کے چشم دید مشاہدات کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً ایک جگہ وہ کہتا ہے،

مہر دیدم بامدادان چوں بتافت   از خراساں سوے خاور می شتافت

اب معلوم نہیں یہ شاعرانہ انداز بیان ہے یا ایک امر واقعہ، مولانا شبلی نے رودکی کی صرف ایک مثنوی کلیلہ دمنہ کا ذکر کیا ہے، جس کو انھوں نے نایاب بتایا ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم بھی یہی لکھتے ہیں البتہ انھوں نے رودکی کی تین اور مثنویوں کے نام لکھے ہیں، دوران آفتاب، عرائس النفائس اور سندبادنامہ، مگر ان کو بھی وہ نایاب ہی بتاتے ہیں،

اسی کے بعد پروفیسر عبدالغنی مرزایوف کے مضمون کو پڑھا جس میں رودکی کے اشعار کے ایک جعلی مخطوطہ پر بحث کرتے ہوئے، بہت سے ایسے اشعار پیش کئے ہیں جو ان کے خیال کے مطابق رودکی کے نہیں بلکہ قطران کے ہیں، اس مقالہ کے بعد رودکی کے اشعار جب نظر سے گزرینگے، یہ شبہہ پیدا ہو جائیگا کہ معلوم نہیں اسی کے ہیں یا اس کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں، جب تک کہ رودکی کا کوئی مستند مجموعہ کلام ہاتھوں میں نہ آجائے، یہ فارسی شاعر اب سے پہلے ایک ہزار ساٹھ سال پہلے گذرا ہے، لیکن اس کی شاعری اب تک ارباب ذوق کو مائل کئے ہوئے ہے، یہ وہی شاعر ہے، جس کی شاعری پر نظامی سمرقندی کے زمانہ میں کسی نے اعتراض کیا تو نظامی نے اس کے جواب میں لکھا،

اے آنکہ طعن کردی در شعر رودکی   ایں طعن کردن تو از جہل و کودکی است

کانکس کہ شعر داند، داند کہ در جہاں   صاحب قران شاعری استاد رودکی است

میری نظر اس پر بھی گئی کہ ہندوستان کے اندر فارسی زبان کے ہندی الاصل اہل قلم اور شعراء پر اس مجموعہ میں کیا کچھ لکھا گیا ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر ضیاءالدین عبدالحی دیسائی کے فاضلانہ مضمون "مطیع کی گنج معانی" کو بہت شوق سے پڑھا، ڈاکٹر ڈیسائی نے اس مقالہ کے سلسلہ میں گجرات میں بہت سی لکھی ہوئی فارسی تصانیف کا ذکر کرکے اپنے ناظرین کو مستفید کیا ہے، مثلاً گجرات کے ایک بزرگ حضرت شاہ عالم (المتوفی ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء) کی تو تصانیف جمعۃ الشاہیہ، رسالہ مفاتح خزائن اللہ، رسالہ حسینیہ حنفیہ رسالہ باقریہ، رسالہ کاظمیہ، رسالہ رضوانیہ، رسالہ محمدیہ اور رسالہ جلالیہ کا ذکر کیا ہے، اسی طرح مدارج المعارف از حضرت قطب عالم، زاد العاشقین فی سبیل الصادقین از مولانا شیخ عبداللطیف، بہجۃ العارفین وحلاوت العارفین از شیخ عبدالغنی بمبئی، شرح اسمار الاسرار از میر سید کمال قزوینی، شرح مقاصد از مولانا سعدالدین، جواہر جلال از مولانا فضل اللہ، کنوز محمدی از شیخ فریدالدین محمد مرآۃ الجمال از یانعی، جامعۃ الطرق البرہانہ، ملفوظات قطبیہ از حضرت شاہ عالم، فتوح الحرمین از محی لاری وغیرہ کے متعلق بھی معلومات فراہم کئے ہیں، گجرات کے فارسی شعراء میں ملک محمود بیابانی، مولانا خواجہ شروانی، حسینی، مولانا صدرالدین، حسین، اللہ دیا، شرف جہاں کو روشناس کرایا ہے، اس قسم کے معلومات فراہم کرکے لائق مقالہ نگار نے گجرات کے ایک شاعر مطیع کی مثنوی گنج معانی پر بڑا پر مغز مقالہ لکھا ہے، مطیع سولہویں صدی کا شاعر ہے، جو کچھ دنوں گجرات کے مظفر شاہ کے نزدیک بہادر شاہ (۹۳۲ھ/۱۵۲۶-۳۷ء) کے دربار سے وابستہ رہا، یہ مثنوی بہادر شاہ کی مدح میں لکھی گئی تھی، فاضل مقالہ نگار نے اس میں سے کچھ تاریخی معلومات بھی حاصل کئے ہیں،

ڈاکٹر جیانتی دت نے اپنے مضمون میں بنگال کے ان تمام سلاطین کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے بنگال میں عربی اور فارسی زبان و ادب کی ترویج کی کوشش کی ہے، ان کی تحقیق ہے کہ بنگال کے اولین مسلم مصنف قاضی رکن الدین ابو حامد محمد بن محمد العمیدی سمرقندی تھے، ان کی وفات بخارا میں ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء

میں ہوئی، وہ کتاب الارشاد کے مصنف ہیں، انھوں نے سنسکرت کی مشہور کتاب امرت کنڈ کا ترجمہ بھی فارسی اور عربی میں کیا، اس کا نام حوض الحیاۃ رکھا، یہ کتاب یوگ پر ہے، اس مضمون میں حضرت شرف الدین یحیٰ منیری کے مرشد شیخ شرف الدین ابو توامہ کی علمی سرگرمیوں کا بھی ذکر ہے، فاضل مقالہ نگار نے اس مضمون میں ڈھاکہ کے مشہور مورخ عبد الکریم کے حوالہ سے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ بنگال کے سلطان باربک شاہ کے دربار سے بہت سے علمار اور شعرا وابستہ تھے، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں، ابراہیم قوام فاروقی، ملک الشعرا امیر زین الدین ہروی، افتخار الحکمار، حکیم کرمانی، منصور شیرازی، ملک یوسف بن حامد، سید جلال، سید محمد رکن، سید حسن، شیخ وحیدی وغیرہ، لیکن بدقسمتی سے اب ان میں سے کسی کی کوئی علمی یا ادبی چیز باقی نہیں ہے، صرف اتنا معلوم ہے، امیر شہاب الدین نے ایک لغت لکھی، ابراہیم قوام فاروقی ایک فارسی لغت فرہنگ ابراہیمی المعروف بہ شرفنامہ قلمبند لکھی

ڈاکٹر محمد عبد الحمید فاروقی کا مضمون "محمد عارف شیدا" پر ہے، شیدا جہانگیر اور شاہ جہاں کے دربار سے وابستہ رہا، اپنے زمانہ کا بہت ہی ذہین، پرگو اور ذی علم شاعر تھا، تمام شعرا اس کی خردہ گیری، عیب جوئی اور ہجو گوئی سے عاجز تھے، وہ ہندی الاصل شاعر تھا، اس لئے ان ایرانی الاصل شعرا کی خبر خوب لیتا رہا، جو اپنے پندار اور غرور میں ہندوستانی نژاد فارسی شعرار کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے، اس کے دیوان میں تقریباً ایک لاکھ اشعار تھے، اردو میں اس شاعر کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، لیکن ڈاکٹر فاروقی نے اس شاعر کو انگریزی داں طبقہ میں روشناس کر کے مفید کام انجام دیا، یہ شاعر اس کا مستحق ہے کہ اس پر پوری ایک کتاب لکھی جائے،

اس مجموعہ میں راقم کا بھی مضمون ہند نژاد فارسی شعرار پر ہے، اس مضمون کے متعلق تو اس مجموعہ کے ناظرین خود اپنی رائے قائم کر لیں، لیکن اس مضمون کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ایرانی شعرا اور سبک ایرانی کے تعصب اور پندار کو چھوڑیں، اور غیر جانبداری سے ہند نژاد شعرا کے

کارناموں کا بھی مطالعہ کریں کیونکہ ممکن ہے کہ ہندوستان کی آیندہ نسل فارسی زبان سے بالکل اجنبی ہو جائے، پھر یہ قیمتی وراثت کے تنہا حصہ دار اور مالک ایرانی ہی ہو کر رہیں گے،

پروفیسر ہارون خاں شروانی دکن کی مسلمان حکومتوں کے بڑے مستند مورخ سمجھے جاتے ہیں، اس مضمون میں دکن کی قطب شاہی حکومت کے آخری دور میں زبان، تعمیرات، مصوری، رقص اور ڈرامہ نویسی میں جو سرگرمیاں دکھائی دیں ان کی تفصیل ہے، زبان کی ترقی کے سلسلہ میں دکنی اردو اور تیلگو کا ذکر ہے، فارسی تصنیف میں حدیقۃ السلاطین پر ایک تبصرہ ہے، جو ۱۶۴۱ء میں لکھی گئی، شاہی حکمرانوں کے ساتھ اور دوسرے فارسی شعرار کا بھی تذکرہ ہے، ایک مضمون فارسی زبان میں ملک الشعرار بہار" اور ایک عربی زبان میں مسالۃ صفات الذاکرین والمتفکرین میں ہے، مو خرالذکر مضمون کے لکھنے والے مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی ہیں، جو ہندوستان کے ان چند عربی اہل قلم میں سے ہیں جو عربی میں مضامین بڑی بے تکلفی سے لکھتے ہیں،

اس طرح اس پورے مجموعہ میں علم و فن کا ایک اچھا خزانہ جمع ہو گیا ہے، اس کی ترتیب و تدوین کے لئے اڈیٹوریل بورڈ کے ارکین مبارکباد کے مستحق ہیں، جناب خواجہ محمد یوسف اور ام۔ اے۔ مجید صاحب خاص طور پر اہل علم کی طرف سے تہنیت قبول کریں کہ ان کی غیر معمولی محنت و کاوش سے یہ جلد علمی حلقہ تک پہنچی، اس کی قیمت پچاس روپیے ہے، ایران سوسائٹی، ۱۲ ڈاکٹر محمد اسحٰق اسٹریٹ کلکتہ ۱۶ سے مل سکتی ہے،

مطبوعات جدیدہ

علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں:- مرتبہ جناب سید الطاف علی بریلوی و محمد ایوب قادری صاحبان متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۴۶۴ مجلد قیمت ۱۲ر پتہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس سعیدہ منزل متصل سرسید گرلس کالج ناظم آباد کراچی ۱۸

سرسید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ اور بعض دوسرے قومی و ملی مقاصد کے لئے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی تھی، جو آگے چل کر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے مشہور ہوئی، اس کے سالانہ اجلاس تقریباً ساٹھ سال تک ملک کے بڑے اور مرکزی شہروں میں ہوتے رہے، جن میں ملت کے نامور ارباب فضل و کمال اور منتخب الرائے اصحاب شریک ہوکر اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے، کانفرنس کے اجلاس میں فاضلانہ خطبۂ صدارت عالمانہ تقریروں اور مفید تجویزوں کے ساتھ اکابر شعراء ولولہ انگیز نظمیں بھی پڑھتے تھے جن سے قوم و ملت کو درس عمل حاصل ہوتا تھا، اب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) کے سابق اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے موجودہ سکریٹری جناب سید الطاف علی بریلوی نے اپنے رفیق کار محمد ایوب صاحب قادری کے تعاون سے ان تاریخی اور اہم نظموں کو مرتب کر کے شائع کیا ہے، ان میں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی کی بھی بعض نظمیں ہیں، یہ مجموعہ مولانا شبلی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، فضل حق آزاد، علی حیدر طباطبائی، بے نظیر شاہ، اسماعیل میرٹھی، مولانا محمد علی جوہر،

علامہ اقبال، مولوی وحید الدین سلیم صفی لکھنوی، مولانا ظفر علی خاں، رضا علی وحشت اور مولوی امجد علی اشہری جیسے مشاہیر علم و فن کے علاوہ دوسرے متعدد اہل کمال کی منظومات پر مشتمل ہے، فاضل مرتبین نے نظموں کے ساتھ ہر اجلاس کی ضروری کاروائی صدروں کے مختصر حالات اور اہم تجویزیں بھی قلمبند کر دی ہیں اور بعض صدارتی تقریروں، خطبوں اور اہم تقریروں کے اقتباسات بھی نقل کر دئے ہیں، جن شعراء کی نظمیں ہیں آخر میں ان کے مختصر حالات بھی دیدئے ہیں، سب سے آخر میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے گذشتہ تمام جلسوں کے سنین، مقامات اور ان کے صدر کے ناموں کی فہرست بھی دیدی ہے، مجموعہ کے شروع میں بریلوی صاحب کے قلم سے مقدمہ ہے، جس میں سرسید کی اصلاحی، تعلیمی اور قومی خدمات، علی گڑھ تحریک اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد اور کارناموں کا ذکر ہے اس لحاظ سے یہ مجموعہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مختصر تاریخ اور اس کے کارناموں کی سرگذشت بھی ہے۔

فضائل درود شریف:- مرتبہ مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۱۶۴ مجلد قیمت [illegible] پیسے ناشر کتبخانہ یحیوی مظاہر علوم سہارنپور۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے افادات میں بعض اعمال و عبادات کے فضائل و برکات سے متعلق مفید رسائل بھی ہیں، زیر نظر رسالہ اسی نوعیت کا ہے، اس میں درود شریف کے فضائل تحریر کئے گئے ہیں، چند سال قبل اسکا پہلا ایڈیشن چھپا تھا، اب دوسرا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے، یہ پانچ فصلوں میں ہے پہلی فصل میں درود شریف کے فضائل کی بعض آیتیں اور متعدد حدیثیں اور دوسری میں خاص خاص درودوں کی فضیلت کی روایتیں درج ہیں، تیسری میں درود نہ پڑھنے کے بارہ میں حدیثوں کے اندر وارد وعیدوں کو نقل کیا

گیا ہے۔ چوتھی فصل میں درود کی اہمیت و آداب سے متعلق عام فوائد بیان کئے گئے ہیں اور پانچویں فصل میں بزرگوں کی ان حکایتوں کا ذکر ہے جن سے درود شریف کا وسیلۂ نجات اور ذریعہ بخشائش ہونا ثابت ہوتا ہے، یہ رسالہ بڑا بیش قیمت ہے، اردو میں غالباً اس سے بہتر اور جامع رسالہ فضائل درود میں نہیں لکھا گیا ہے، حضرت شیخ نے فضائل درود کی جو حدیثیں نقل کی ہیں ان کے ہم معنی اور بہت سی حدیثیں نقل کر کے عجیب عجیب حقائق اور دلچسپ نکات تحریر فرمائے ہیں لیکن غالباً فضائل و ترغیبات میں توسع کی بنا پر ضعیف روایات نقل کرنے سے احتراز نہیں کیا گیا ہے۔

قرآن سے ستاروں تک :- مرتبہ جناب محمد عبد اللہ صاحب دہلوی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت ے پتہ مکتبہ نور حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۳۔

موجودہ خلائی پرواز اور سیاروں پر انسانی قدم پہنچنے سے مذہب کے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہو گئے ہیں، اس کے جواب میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے اس میں سائنسی انکشافات اور خلائی پروازوں کے بارہ میں اسلامی نقطہ نظر پیش کر کے دکھایا گیا ہے کہ ان سے اسلامی تعلیمات کو نقصان پہونچنے کے بجائے اسکی تائید ہوتی ہے اور کائنات سے متعلق قرآنی آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ موجودہ ایجادات و انکشافات اور خلائی پرواز وغیرہ میں سے کوئی چیز بھی اسلام کے خلاف نہیں ہے بلکہ اسکی موید اور منشائے الٰہی کی تکمیل ہے، اس سلسلہ میں بڑے دلچسپ نکات آگئے ہیں، اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اختصار کے باوجود یہ کتاب ان سب میں بہتر ہے۔

مضراب :- از جناب فیضی نظام پوری صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و

طباعت اچھی صفحات ۱۲۸ مجلد مع گرد پوش قیمت للعہ پتہ فیضی نظام پوری، ۵۰۔ نظام پور بھیمڑی ضلع تھانہ۔

جناب فیضی نظام پوری (بھیمڑی بمبئی) کے ایک نوجوان شاعر ہیں، یہ مجموعہ انکی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، انھوں نے موجودہ ادبی بے راہ روی سے اپنے کلام کو محفوظ رکھا ہے اور روایتی انداز کی شاعری میں بھی جدید حالات و مسائل کی عکاسی کی ہے، انکی بعض نظمیں "یوم آزادی"، "امن و جنگ"، "آزاد و محکوم" اور "اردو زبان" وغیرہ خاصی ولولہ انگیز ہیں بعض نظموں میں انھوں نے قوم و وطن کے نوجوانوں کو درس و پیام دیا ہے اور غزلوں میں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی حکایت بھی ہے فیضی صاحب میں شعر و سخن کا ذوق و استعداد موجود ہے مشق و ممارست کے بعد ان کے کلام میں مزید پختگی پیدا ہوگی۔

مسلمان اور عصری مسائل :- مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۸ مجلد قیمت صہ پیسے پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مشہور علمی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" میں بلند پایہ علمی مضامین کے ساتھ اس کے فاضل اڈیٹر کے قلم سے "مسلمان اور مسائل حاضرہ" پر بھی اظہار خیال ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب ادیب اور مفکر بھی ہیں اور ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد بھی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ترقی کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہیں، اس لئے ان کے خیالات بڑے مفکرانہ اور سنجیدگی کیساتھ غور و فکر کے لائق ہوتے ہیں، اسمیں شبہہ نہیں کہ مسلمانوں کے لئے جدید مسائل کا حل ضروری ہے مگر یہ بڑا نازک کام ہے، اسکے لئے فہم و تدبر علمی و عقلی نقطہ نظر کیساتھ دین سے لگاؤ اور دینی نقطہ نظر سے واقفیت بھی ضروری ہے تاکہ اسلام کا سر رشتہ بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور مسلمان اسی دور

مسابقت میں کسی سے پیچھے بھی نہ رہیں، ڈاکٹر صاحب میں یہ سب شرائط پائے جاتے ہیں، اسلئے انکے خیالات میں بڑا اعتدال و توازن ہے، انکا قلم جامِ شریعت اور سندانِ عشق دونوں کا حق ادا کرتا ہے، اور حتی الامکان انکے ہاتھ سے دین کا سررشتہ نہیں چھوٹتا، یہ مضامین اسکا نمونہ ہیں لیکن مغربی تہذیب کی بنیاد تمامتر مادیت پر ہے اور اس سے پیدا شدہ مسائل کا نقطۂ نظر بھی مادی ہے جسکی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں ہوتی، اسلئے اعتدال و توازن کے باوجود بعض مسائل میں دونوں کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، مصنف کو بھی یہ دشواری پیش آئی ہے، جس کی جھلک ان مضامین میں نظر آتی ہے، لیکن عموماً ان کا قلم جادۂ اعتدال پر قائم رہتا ہے، اور اس حیثیت سے ان کے خیالات بڑے قابل قدر اور مسلمانوں کے غور و فکر کے مستحق ہیں۔

"م"

فارم ۱۷
دیکھو رول نمبر ۸
معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت :۔	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت :۔	ماہانہ
نام پرنٹر :۔	سید اقبال احمد
قومیت :۔	ہندوستانی
پتہ :۔	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر :۔	"
قومیت :۔	ہندوستانی
پتہ :۔	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر :۔	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت :۔	ہندوستانی
پتہ :۔	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ "سید اقبال احمد"

جلد ۱۱ ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۹۷۳ء عدد ۶

مضامین

مقالات

سابقت میں کسی سے پیچھے بھی نہ رہیں، ڈاکٹر صاحب میں یہ سب شرائط پائے جاتے ہیں، اسلئے انکے خیالات میں بڑا اعتدال و توازن ہے، انکا قلم جام شریعت اور سندان عشق دونوں کا حق ادا کرتا ہے، اور حتی الامکان انکے ہاتھ سے دین کا سررشتہ نہیں چھوٹتا، یہ مضامین اسکا نمونہ ہیں لیکن مغربی تہذیب کی بنیاد تمامتر مادیت پر ہے اور اس سے پیدا شدہ مسائل کا نقطۂ نظر بھی مادی ہے، جسکی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں ہوتی، اسلئے اعتدال و توازن کے باوجود بعض مسائل میں دونوں کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، مصنف کو بھی یہ دشواری پیش آئی ہے، جس کی جھلک ان مضامین میں نظر آتی ہے، لیکن عموماً ان کا قلم جادۂ اعتدال پر قائم رہتا ہے، اور اس حیثیت سے ان کے خیالات بڑے قابل قدر اور مسلمانوں کے غور و فکر کے مستحق ہیں۔

"م"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت:- دار المصنفین اعظم گڈھ

نوعیت اشاعت:- ماہانہ

نام پرنٹر:- سید اقبال احمد

قومیت:- ہندوستانی

پتہ:- دار المصنفین اعظم گڈھ

نام پبلشر:- "

قومیت:- ہندوستانی

پتہ:- دار المصنفین اعظم گڈھ

اڈیٹر:- شاہ معین الدین احمد ندوی

قومیت:- ہندوستانی

پتہ:- دار المصنفین اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ "سید اقبال احمد"

جلد ۱۱ ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۹۷۳ء عدد ۴

مضامین

مقالات